قرآن ہادی

(سوالات و جوابات)

جوابات از

علمائے قم و نجف

مرتبہ

مجاہد حسین حرؔ

ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔

نام کتاب.............................. قرآن ہادی (سوالات و جوابات)

جوابات از.............................. علمائے قم و نجف

مرتبہ.............................. مجاہد حسین حرّ

پروف ریڈنگ.............................. خانم شازیہ غضنفر

کمپوزنگ.............................. قائم گرافکس۔ جامعہ علمیہ۔ ڈیفنس فیز ۴

ناشر.............................. معراج کمپنی لاہور

ہدیہ..............................

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

بیسمنٹ میاں مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار۔ لاہور

03214971214،04237361214

محمد علی بک ایجنسی اسلام آباد

03335234311

انتساب

قرآن کریم

سے

انس ومحبت

رکھنے والوں

کے نام

عرض ناشر

مصباح القرآن ٹرسٹ محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کی ان صدقاتِ جاریہ میں سے ہے جس سے لوگ تا قیامت استفادہ کرتے رہیں گے اور موصوف کے درجات عالیہ میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مصباح القرآن ٹرسٹ نے تراجم و تفاسیر قرآن سے کام شروع کیا اور پھر ہر وہ کتاب جس کی ملت کو ضرورت تھی شائع کی انشاء اللہ العزیز شائع کی جاتی رہے گی۔

موجودہ کتاب "قرآن ہادی" قرآنی معرفت کا ایک سلسلہ ہے۔ قرآن مجید سے شغف رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک مفید تحفہ ہو گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ آپ کو پسند آئے گی۔

یاد رہے کہ مصباح القرآن نے اپنی تمام کتابیں آپ کے استفادہ کے لئے انٹرنیٹ پر دے دی ہیں۔ ایڈریس ہے:

www.misbahulqurantrust.com

قارئین کرام سے التماس ہے کہ اگر وہ اس کتاب میں کہیں خامی دیکھیں یا کمی محسوس کریں تو ہمیں مطلع ضرور فرمائیں ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔ ادارہ کے ترقی اور اس کے بانی محسن ملت سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہ کے درجات کی بلندی کے لئے دعا کے طالب ہیں۔

ادارہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور پاکستان

فہرست کتاب

کیا ابلیس کی داستان حقیقی ہے یا تمثیل ہے؟ 7

قرآن کے کس سورہ کو پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے؟ 16

ذہن کو قوت بخشنے والے معنوی اور مادی طریقوں کو احادیث اور آیات کی روشنی میں بیان کیجئے؟ 20

آخرت میں اندھے پن کے کیا معنی ہیں؟ 28

عبداللہ بن ابی سرح کے تغییر قرآن کی داستان کے باوجود قرآن مجید کی عدم تحریف کیسے سازگار ہوسکتی ہے؟ 34

قرآن مجید میں مسلمان کن معنی میں آیا ہے؟ 43

کیا یہ کہا جاسکتا ہے، چونکہ آیہ تطہیر آیت کے وسط میں قرار پائی ہے، اس لئے حصر پر دلالت نہیں کرتی ہے؟! اہل بیت کون ہیں؟ 47

کیا کتاب الٰہی میں ہر رطب و یابس (تر وخشک) موجود ہے؟ کیا کتاب سے مراد یہی قرآن مجید ہے؟ رطب و یابس سے مراد کیا ہے؟ اور یہ کیسی موجودات ہیں؟ 61

قرآن کے اسماء کو بیان فرمائیے۔ 65

سورۂ مبارکۂ صافات میں لفظ مخلَصین اسم مفعول کی صورت میں کیوں استعمال ہوا ہے؟ کیا اسم مفعول کو اسم فاعل کے مقابلہ میں برتری حاصل ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم، فقط جن لوگوں نے خود کو خالص بنالیا ہے، انہیں ہلاک نہیں کرے گا؟ 71

قیامت میں شفاعت کا کیا مقام ہے؟ 75

بیوی کی اپنے شوہر سے میراث لینے میں ناانصافی کی کیا وجہ ہے؟ 82

کیا قرآنی آیات اور دعائیں، کامیاب مطالعہ کرنے اور بہتر سیکھنے میں مؤثر ہیں؟ 86

کیا اسلام کی نظر میں، ایک قاتل اور جارح کافر کے گناہ، اس کے مسلمان ہونے سے معاف ہوتے ہیں؟ 93

کیا ابلیس کی داستان حقیقی ہے یا تمثیل ہے؟

مختصر جواب

جواب سے پہلے قابل ذکر بات ہے کہ اشیاء کی تعریف کے طریقوں میں سے ایک طریقہ مثل کے ذریعہ تعریف کرنا ہے،یعنی حقائق عقلی کی حسی اور قابل لمس امور سے تشبیہ دینا،تا کہ اکثر لوگ آسانی کے ساتھ اس کا ادراک کرسکیں اور سمجھ سکیں ۔کیونکہ انسان عموما محسوسات کی عادت رکھتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی مثالوں میں اس روش سے استفادہ کیا گیا ہے اورقرآن مجید نے گوناگوں مواقع پر واقعات کوتمثیل کی صورت میں بیان کیا ہے کہ ابلیس کی داستان ان میں سے ایک ہوسکتی ہے۔البتہ اس سلسلہ میں کہ کیا قرآن مجید کی مثالیں مصداق اور وجود خارجی رکھتی ہیں یا صرف تمثیل ہیں،دونظریے پائے جاتے ہیں:

الف): بعضوں کی نظر میں، یہ مثالیں معروف تشبیہات کی صورت میں ہیں اور حقیقی اور خارجی وجودنہیں رکھتی ہیں،اورصرف عالی معارف، بلند اسرار اور مخفی نظام ہستی کو مادیات سے سروکار والے انسان کے ذہن کے قریب لانے کے لئے ہے۔

ب):بعض دوسرے اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ مثالیں ان حقائق کی مثالی وجود کی حکایت ہیں اوران میں کسی قسم کی تشبیہ اور مجاز گوئی نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کی داستان ایک تکوینی تمثیل ہے اورسجدہ کرنے کا الٰہی حکم

ایک حقیقی امر نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ یہ امر دو حالتوں سے خارج نہیں ہے یا امر مولا اور تشریعی ہے اور یا تکوینی ہے۔ اگر ہم امر کو مولائی فرض کریں تو مشکل سے دوچار ہوتے ہیں، کیونکہ حکم کا خطاب صرف ابلیس کی طرف نہیں تھا بلکہ اس میں ملائکہ بھی شامل تھے، جبکہ ملائکہ تکلیف الٰہی کے مخاطب قرار نہیں پا سکتے ہیں اور دوسری طرف سجدہ کے حکم کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ تشریعی اور تمثیلی ہو، اور اگر حکم تکوینی فرض کیا جائے تو جس چیز کا حکم ہوا ہے وہ مراد الٰہی ہے اور اس کا محقق ہونا ضروری ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی ہے، حالانکہ ابلیس نے سجدہ نہیں کیا ہے اور خلاف ورزی عمل میں آئی ہے۔ اس لئے قضیہ کے حل کی تنہا راہ یہ ہے کہ مذکورہ داستان کو تمثیل مانا جائے۔ البتہ توجہ رکھنی چاہئے کہ داستان کو تمثیل جاننا اس معنی میں نہیں ہے کہ اصل قضیہ واقع نہیں ہوا ہے اور صرف ایک افسانوی داستان ہے، بلکہ امر اعتباری کے دقیق تر معنی واقع ہوئے ہیں اور اس سلسلہ میں وہم و گمان نہیں کرنا چاہئے کہ یہ عظیم الٰہی قضیہ اور اہم دینی حقیقت بنیادی طور پر خارج میں محقق نہیں ہوئی ہے۔

تفصیلی جوابات

جواب کو بیان کرنے سے پہلے چند مطالب کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے:

۱۔ ابلیس اور تمثیل کے الفاظ کا مفہوم: ابلیس: قرآن مجید میں اس لفظ سے مراد، ایک زندہ باشعور، مکلف، نامرئی اور فریب کارو۔۔۔ مخلوق ہے، جس نے حکم خدا کی نافرمانی کر کے آدم کو سجدہ نہیں کیا، جس کے نتیجہ میں اس کا اخراج ہوا اور عذاب کا مستحق قرار پایا۔ اسے قرآن مجید میں اکثر جگہوں پر شیطان کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور صرف گیارہ مواقع پر شیطان کی جگہ پر ابلیس کا نام استعمال ہوا ہے۔[1]

کتاب لسان العرب میں، ابلیس، رحمت خدا سے ناامید اور پشیمان کے معنی میں ہے۔

قرآن مجید میں ابلیس کی ماہیت کی طرف اشارہ ہوا ہے (کَانَ مِنَ الۡجِنِّ) ابلیس جنات کی ذات ہے [2] اور ابلیس کے ناموں میں فرق اس کی ماہیت کے تغیر میں کوئی اثر نہیں رکھتا، چنانچہ لفظ ابلیس کے عربی ہونے میں شبہ ہے۔[3]

تمثیل: یعنی مثال پیش کرنا، راغب اصفہان کہتا ہے: **والمثل عبارة عن قول فی شیء یشبه قولا فی شیءآخر بینهما مشابهه لیبین احدهما الآخر** ۔مثال، ایک قول ہے کسی چیز کے بارے میں جو کسی دوسری چیز کے بارے میں شبیہ ہے تاکہ ایک دوسرے کو بیان اور مجسم کرے۔

۲۔قرآن مجید میں مثل کی تعریف اور شیوہ تمثیل: ہر چیز کی تعریف حد سے یا رسم سے اور یا مثل سے کی جاتی ہے۔اشیاء کی حد تام اور رسم تام کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے، کیونکہ اشیاء کی ذاتیات اوران کی ذات کے لوازم کو سمجھنا عام لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن مثل ذاتیات اورذات کے لوازم کو بیان نہیں کرتی، بلکہ مخاطب کے لئے قابل فہم چیز کو اس کی پہچان کا وسیلہ قرار دیتی ہے ۔مثل ایک طرف سے معارف کو نیچے لاتی ہے اور دوسری طرف سے مخاطب کی فکر کو تقویت بخشتی ہے اور اگر کوئی مطلب مخاطب کی فکر کی سطح کے برابر ہو تو وہ اس کے لئے قابل فہم بن جاتا ہے، چنانچہ روح کی بدن سے نسبت سے آشنائی کے لئے مثل، ناخدا کے کشتی سے اور سربراہ کے معاشرے سے رابطہ کے مانند ہے **الروح فی البدن، کالسلطان فی المدینه و کالربان فی السفینه** ۔اس قسم کی تعریف نہ حد کے قسم کی تعریف ہے اور نہ رسم کی تعریف۔[4]

حضرت امام حسینؑ اوراسی طرح امام صادق علیہما السلام فرماتے ہیں: معارف قرآن کے چار درجے ہیں اور انسانوں کا قرآن مجید سے استفادہ کرنا الگ الگ ہے:۔۔۔**علی العبارہ والاشارہ واللطائف والحقائق فالعبارہ للعوام والاشارہ**

للخواص واللطائف للاولیاء والحقائق للانبیاء۔[5]

لیکن قرآن مجید کے تمام مخاطبین اس امر میں مشترک ہیں کہ الٰہی مطالب کو سمجھتے ہیں، اگر چہ فہم کا درجہ مفہوم کے درجہ کے مانند یکساں نہیں ہے۔اس لئے آخر کار سمجھ لیتے ہیں کہ کس چیز کا اعتقاد رکھنا چاہئے اور کیا کرنا چاہئے اور کہاں جائیں اور کہاں نہ جائیں ۔۔۔

مثل کا اصلی محور ممثل کا تناسب ہے جو اس کے ادراک کو آسان بناتا ہے، مثالیں نا قابل نزاع ہیں، مگر یہ کہ رسالت میں نارسا ہوں ۔

حق و باطل کے لئے نور وظلمت کی تمثیل اور جانوروں، پرندوں اور پودوں کی مثالیں نہ صرف غیر عرب اقوام وملل کے محاوروں کی لغات میں مروج ہیں، بلکہ مدنی وبدوی اعراب کے مفاہیم میں بھی رائج ہیں، چنانچہ گزشتہ آسمانی کتابوں، جیسے: تورات وانجیل میں بھی ایسا ہی پہلے سے ملتا ہے۔[6]

۳۔دو نظریوں میں قرآن کی تمثیل: قرآن مجید کی مثالوں کے تجزیہ کے سلسلہ میں خاص کر مصداق کی تشریح میں نہ کہ مفہوم کے بیان میں، صاحبان نظر کے درمیان دو نظریئے پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ مثالیں عرفی تشبیہات کی حد میں ہیں اور صرف بلند معارف اور نظام ہستی کے مخفی اسرار کو مادی دنیا میں زندگی بسر کرنے والے انسان کے ذہن کے قریب لانے کے لئے ہیں ۔

دوسرا نظریہ، یہ ہے کہ مثالیں ان حقائق کے مثالی وجود کی حکایت کرتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی تشبیہ اور مجاز گوئی نہیں ہے۔

ان دو نظریات کا فرق، جہاں پر مثال کے طور پر خداوند متعال انسانوں کو گدھے اور کتے سے تشبیہ دیتا ہے، یہ ہے کہ پہلے نظریہ کے مطابق یہ حقیقت میں گدھے نہیں ہیں، لیکن چونکہ گدھے حقائق کو سمجھنے سے محروم ہیں، اسی لئے اس حیوان سے تشبیہ دی گئی ہے ۔لیکن

دوسرے نظریہ کے مطابق، یہ تمثیل اس میں مثالی حقیقت کی حکایت کرتی ہے، جہاں پر اشیاء کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے وہاں پر مثالی حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس لحاظ سے یہ قیامت کے دن حیوانوں کی شکل میں محشور ہوں گے۔[7]

مندرجہ بالا مطالب کے بیان کے بعد اب مذکورہ سوال دہرایا جاتا ہے کہ: ابلیس کی داستان حقیقی ہے یا صرف ایک تمثیل ہے؟

اس کے جواب میں یوں کہا گیا ہے: سجدہ کا حکم ایک حقیقی حکم نہیں ہوسکتا ہے، کیونکہ اس صورت میں دو حالتوں سے خارج نہیں ہے، یا حکم مولوی اور تشریعی ہے، جیسے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴿۴۳﴾ [8] یا حکم تکوینی ہے جیسے: فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا [9] اور دونوں قسموں میں مشکل پائی جاتی ہے۔ حکم تکوینی کی مشکل یہ ہے کہ، یہ قابل عصیان و انکار نہیں ہے، کیونکہ خداوند متعال کا تکوینی مقصد حتمی طور پر پیدا ہوتا ہے۔[10] حضرت علی علیہ السلام کے قول کے مطابق، خدا کا کلام وہ آواز اور ندا نہیں ہے جو کانوں سے سنی جائے، بلکہ فعل اور ایجاد ہے۔ مولائی و تشریعی حکم کا مشکل یہ ہے کہ فرشتے اہل تکلیف نہیں ہیں اور ان کے لئے وحی، رسالت، امر و نہی مولائی، وعدہ وعید اور عصیان کے مقابلہ میں اطاعت قابل تصور نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی مخلوق بالکل معصوم ہو اور اس میں گناہ کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، اطاعت ضروری ہے اور اگر اطاعت ضروری ہو، تو اس کے بارے میں کفر و استکبار اور معصیت ممنوع ہے اور اس کے بارے میں تشریعی و اعتباری اوامر و نواہی اقتضا نہیں کرتے ہیں۔

ممکن ہے کہ کہا جائے کہ کوئی شک نہیں ہے کہ:

اولاً، اس قسم کے عناوین جنات کے بارے میں قابل تصور ہیں، یعنی انسانوں کے مانند تشریعی اور اعتباری قوانین اور نزول کتب اور انبیاء کی بعثت ان سے بھی تعلق رکھتی ہے۔

ثانیاً، ابلیس جنات میں سے ہے۔

ثالثاً، ابلیس، تشریعی طور پر سجدہ کرنے پر مامور ہوا، اس لحاظ سے اس کے بارے میں عصیان، نافرمانی اور استکبار کا اطلاق ہوا ہے۔

رابعاً، فرشتے اور ابلیس ایک خطاب کے مخاطب اور ایک امر کے مامور قرار پائے ہیں۔ مذکورہ چار مقدموں کے پیش نظر کس طرح ممکن ہے کہ اسجدوا کا امر ابلیس کے بارے میں تشریعی ہو لیکن فرشتوں کے بارے میں نہ ہو؟

جواب یہ ہے کہ:

پہلے، سجدہ کے حکم میں اصلی مخاطب فرشتے ہیں اور ان کے ضمن میں ابلیس بھی درج تھا اور چونکہ اصلی اور اکثر واغلب مخاطبین حکم مولوی وتشریعی کے زمرے میں نہیں آتے ہیں لہٰذا اصل حکم تشریعی نہیں تھا۔

دوسرے یہ کہ، صرف ابلیس کے بارے میں تشریعی کا ممکن ہونا مذکورہ حکم کے تشریعی ہونے کا سبب نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ، ابلیس کے واسطے الگ سے حکم کو ثابت کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہے جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئی ہے، اگر چہ بعض لوگوں نے آیہ اذا امر تک سے اس احتمال کو بعید نہیں جانا ہے۔

چوتھے یہ کہ، ایک حکم کو چھوڑنا اور اسے تشریعی و تمثیلی طور پر تحلیل کرنا خلاف ظاہر ہے اور حکم کو منفک کرنے کے لئے برہان کی ضرورت ہے کہ ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی دلیل قائم نہیں ہوئی ہے۔

مذکورہ مطالب کے پیش نظر فرشتوں کو حکم ہونا دونوں صورتوں میں مشکل ہے اور چونکہ یہ مشکل دور ہونے کے قابل نہیں ہے اور حقیقی حکم کے لئے کوئی تیسری صورت تصور نہیں

کی جاسکتی ہے، اس لئے سجدہ کے حکم کے حقیقی اور واقعی ہونے سے صرف نظر کر کے اسے تمثیل پر حمل کرنا چاہئے، کیونکہ اگر چہ تشریع وتکوین آپس میں ناسازگار ہیں، لیکن ایک دوسرے کی نقیض نہیں ہیں کہ ان کو رفع کرنا محال ہو۔

البتہ سجدہ کے حکم کا تمثیلی ہونا اس معنی میں نہیں ہے کہ سجدہ کا اصلی حکم واقع نہیں ہوا ہے اور ایک افسانوی داستان کی صورت میں بیان ہوا ہے اور یہ ذہن کی تخلیق ہے اور خارج میں واقع نہیں ہوا ہے، بلکہ اس معنی میں ہے کہ ایک معقول حقیقت اور ایک عینی معرفت محسوس اور مشہود صورت میں بیان ہوئی ہے۔ یہ اس کے مانند ہے کہ سورہ حشر میں قرآن مجید کے پہاڑ پر نازل ہونے اور پہاڑ کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کا ذکر ہوا ہے۔[11] دوسرے الفاظ میں حکم واقعی تشریعی اور حکم حقیقی تکوینی کی مشکل بیان کرنے کے بعد اب حکم کے واقعی ہونے کو حفظ کرنے کے ساتھ مذکورہ مشکلات کو دور کرنا چاہئے، یا کوئی تیسری راہ طے کرنی چاہئے کہ اصل حکم اور اس کے محقق ہونے کی بھی توجیہ کی جائے اور ایک ایسی چیز کا تصور کرنا چاہئے جو تشریع وتکوین سے خارج ہو اور حقیقت میں حکم الٰہی شمار ہو جائے، لیکن چونکہ حکم، تکوینی وتشریعی میں منحصر ہے اور مشکلات میں سے کوئی مشکل دور ہونے کے قابل نہیں ہے، اس لئے ہم تیسری راہ کو طے کرتے ہیں، اس طرح کہ امر کے واقعی ہونے سے صرف نظر کریں گے اور اسے تمثیل تکوینی مانا کریں گے۔[12]

آدم علیہ السلام پر سجدہ کا حکم نہ امر تکوینی ہے اور نہ تشریعی ہے، بلکہ ایک حقیقت کی تمثیل ہے اور وہ حقیقت یہ ہے کہ عالم امکان میں بلندترین مقام مقام انسانیت اور مقام خلیفہ اللہ ہے کہ فرشتے اس کے مقابل میں خضوع کرتے ہیں، لیکن شیطان اس مقام کا راہزن ہے۔[13]

قرآن مجید میں پچاس سے زیادہ مثالیں پائی جاتی ہیں اور صرف سورہ بقرہ میں کم

از کم دس مثالیں ذکر ہوئی ہیں ۔ان مثالوں میں کونسا فلسفہ مخفی ہے کہ خداوند متعال نے اس قدر مثالیں پیش کی ہیں؟

قرآن مجید کی بعض آیات میں قرآنی مثالوں کا مقصد بیان کیا گیا ہے کہ ہم ذیل میں ان کے تین نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔یہ مثالیں تذکر اور یاد حقیقتوں کے لئے ہیں اور ان کے ذریعہ پیغام الٰہی کی حقیقت ذہن میں اجاگر ہوتی ہے۔

۲۔یہ مثالیں ہستی کی حقائق کے بارے میں غور وفکر کرنے کے لئے ہیں، کیونکہ موضوع پر غور وفکر کرنے سے اس کا فلسفہ معلوم ہوتا ہے۔

۳۔یہ مثالیں ادراک کیلئے ہیں اور غور وفکر سے حقائق کی پہچان ہوتی ہے ۔یہ مقاصد انسان کے فہم وادراک کی تکمیل سفر کے تین مرحلے شمار ہو سکتے ہیں، جو بالترتیب سورہ ابراہیمؑ،آیت نمب ۲۵ ،سورہ حشر،آیت نمبر ۲۱ اور سورہ عنکبوت آیت نمبر ۴۳ میں ذکر ہوئے ہیں ۔[14]

حواشی

[1] قرشی،سید علی اکبر،قاموس قرآن،لفظ ابلیس۔

[2] ملاحظہ ہو: شیطان،فرشتہ یا جن،سوال ۸۵۷۔

[3] آیت اللہ جوادی،عبداللہ،تسنیم،ج ۳،ص ۳۱۹۔

[4] آیت اللہ جوادی،عبداللہ،تسنیم،ج ۲،ص ۵۲۵۔

[5] بحارالانوار،ج ۷۵،ص ۲۷۸۔

[6] تسنیم،ج ۲،ص ۵۰۹۔

[7] تسنیم،ج ۲،ص ۲۳۱۔

[8] بقرہ۔ ۴۳۔

[9] فصلت۔ 11۔

[10] یس۔۸۲۔

[11] حشر۔۲۱۔

[12] آیت اللہ جوادی،عبداللہ،تفسیر موضوعی،ج۶،ص۱۸۳۔

[13] تمثیل پر حمل صرف ان مواقع پر جائز ہے جہاں پر عقلی یا نقلی بر ہان موجود ہو۔اس لئے اعتقادی اصول اور قرآن مجید کے دوسرے مباحث میں سے کوئی ایک تمثیل پر حمل نہیں ہوتے ہیں ۔

[14] آیت اللہ مکارم شیرازی، ناصر مثال ہای زیبای قرآن،ص۱۵۔

قرآن کے کس سورہ کو پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے؟

مختصر جواب

قرآن کتابِ عمل ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے قرآن مجید کو زندگی کا دستور اور انسان سازی کے لئے کامل نمونہ درس کی نظر سے دیکھنا چاہئے ۔ جو لوگ صرف بعض سوروں کی تلاوت یا ان سوروں کی تلاوت کے پیچھے ہیں جن کے ثواب زیادہ ہیں تو وہ دوسری سورتوں کے ثواب سے محروم رہتے ہیں، سارے قرآن کی تلاوت کرنی چاہئے اور اس کے پورے دستور پر عمل کرنا چاہئے ۔

اگر چہ روایات میں ہر سورے کے لئے ایک خاص فضیلت اور برکت بیان کی گئی ہے خصوصا سورہ حمد کی جانب زیادہ توجہ دلائی گئی ہے، اور اس کو قرآن کے دو تہائی حصے کے برابر قرار دیا گیا ہے یا آیۃ الکرسی کو بہت ہی نافع اور زیادہ با فضیلت بیان کیا گیا ہے اور اسی طرح سورہ توحید کو ایک تہائی قرآن قرار دیا گیا ہے اور بعض دوسرے سوروں کی بھی خاص فضیلت بیان کی گئی ہے۔

تفصیلی جوابات

قرآن کریم کی سب سورتوں کی قرأت اور تلاوت میں دنیوی اور اخروی اثرات کے علاوہ اور بھی بے شمار اثرات موجود ہیں۔قرآن مجید کے ہر سورے کے لئے خاص فضائل بیان ہوئے ہیں، البتہ اس نکتہ کی جانب توجہ کرنی چاہئے کہ قرآن ایک مکمل ضابطۂ حیات اور

عمل کرنے کی کتاب ہے اور اس کی تلاوت، اس پر فکر کرنے اور ایمان لانے کے لئے نقطۂ آغاز ہے اور اس کے مطالب اس پر عمل کرنے کا ایک وسیلہ ہیں اور نیک بندوں کیلئے اجر بھی انہیں شرائط کے ساتھ متحقق ہوتا ہے۔

دوسرا نکتہ جو قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں قرآن مجید کی قرأت کو تجارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ صرف اس بات کے پیچھے رہیں کہ کس سورہ میں زیادہ ثواب ہے اور ہمیشہ صرف اسی سورہ کی تلاوت کر کے دوسری سورتوں کی برکتوں سے محروم رہیں قرآن ایک ایسی جامع کتاب ہے جو تمام باہم مربوط اور وابستہ ہے اور انسان پورے قرآن سے فائدہ حاصل کر کے خودسازی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

البتہ روایات میں ہر سورہ کے لئے یا قرآن مجید کے بعض حصوں کے لئے خاص فضائل اور برکات ذکر ہوئے ہیں۔ نمونہ کے طور پر ان میں سے بعض فضائل کو ذکر کریں گے۔

۱۔ بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی فضیلت:

اسلامی روایات میں اس آیہ شریفہ کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کو اسم اعظم کی صف میں قرار دیا گیا ہے حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ خدا کے اسم اعظم سے، آنکھ کی پتلی، اس کی سفیدی کی بہ نسبت زیادہ نزدیک ہے [1]

اور اسی مضمون کی بہت سی روایات بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں۔

قرآنی سورتوں کی فضیلت کے بارے میں ہر سورت کے لئے فضیلتیں ذکر ہوئی ہیں مثال کے طور پر سورہ حمد کے بارے میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ

آپ نے فرمایا: جو بھی سورہ فاتحہ الکتاب کو پڑھے گا اس کو اتنا اجر عطا ہوگا کہ جیسے اس نے قرآن مجید کی دو تہائی کی تلاوت کی ہے۔ اور ہر مومن کی طرف سے صدقہ دیا ہے [2]

ایک اور روایت میں آیا ہے کہ جو کوئی سورہ حمد کی تلاوت کرے گا وہ خدا سے جو بھی چاہے گا اس کو عطا کیا جائے گا یا سورہ حمد کو ہر درد اور بیماری کی شفا جانا گیا ہے۔

بہرحال اس سوہ کی اہمیت کے بارے میں کافی روایتیں وارد ہوئی ہیں اور اس کی قرأت کا کافی ثواب ہے۔

سورہ توحید کی فضیلت میں بھی کافی روایتیں وارد ہوئی ہیں من جملہ یہ کہ سورہ توحید کو قرآن کا ایک تہائی حصہ جانا گیا ہے۔ اور جو سورہ توحید پڑھتا ہو اس کے جنازے کی مُشایعت میں ستر ہزار ملک شرکت کرتے ہیں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو بھی خداوند متعال اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے وہ سورۂ توحید کی قرأت کو نماز کے بعد پڑھنا نہ بھولے، کیونکہ کہ جو بھی اس کو پڑھے گا دنیا اور آخرت کے خیر کو اس کے لئے اکٹھا کیا جائے گا، اور خود اس کو اور اس کے والدین اور اس کے فرزندوں کو بخش دیا جائے گا۔ [3]

سورۂ بقرہ کے بارے میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کونسا سورہ سب سوروں سے افضل ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سورۂ بقرہ اور اس میں آیۃ الکرسی۔

آیۃ الکرسی کا ثواب اتنا زیادہ ہے کہ شیعہ اور سنیوں نے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی مومن آیۃ الکرسی کی تلاوت کرے گا اور اس کے ثواب، اہلِ قبور کو ہدیہ کرے گا خداوند متعال ہر حرف کے مقابلے میں اس کے لئے ایک فرشتہ قرار دے گا جو قیامت کے دن تک اس کے لئے تسبیح کرے گا۔

سورہ آل عمران کی فضیلت میں وارد ہوا ہے کہ جو بھی اس سورہ کو پڑھے گا اس کی ہر

ایک آیت، دوزخ کے پُل سے گزرنے کی ایک امان ہے [4]

اور سورہ نساء کے بارے میں وارد ہوا ہے کہ جو بھی جمعہ کے دن سورہ نساء کو پڑھے گا وہ فشار قبر سے امان میں رہے گا [5]

اور سورہ مائدہ کے بارے میں آیا ہے کہ جو بھی اسے ہر پنجشنبہ کو پڑھے گا اس کا ایمان آلودہ نہیں ہوگا، اور وہ خدا کے لئے شریک قرار نہیں دے گا۔

اسی طرح آنحضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت میں منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا: کیا دو سورے آپ کو تعلیم کروں جو قرآن کے سب سے بہترین سورے ہیں؟ عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معوذتین، (سورہ فلق اور سورہ ناس) کی اُسے تعلیم دی، پھر ان دو کو نماز صبح میں قرأت کیا اور فرمایا کہ جب اٹھتے ہو اور جب سوتے ہو ان دو سوروں کی تلاوت کرو۔ [6]

خلاصہ یہ کہ قرآن کی ہر سورت کی ایک خاصیت ہے پس آسانی سے یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کس سورہ کا زیادہ ثواب ہے بلکہ سب قرآن کی تلاوت کرنی چاہئے اور پورے قرآن کے فضائل سے بہرہ مند ہونا چاہئے۔

حواشی

[1] تفسیر برھان، ج ۱ ص ۴۱۔

[2] تفسیر المجمع البیان، مج ۱ ص ۱۴ و ۱۵۔

[3] تفسیر نمونہ، ج ۲۷، ص ۳۲۹۔

[4] مجمع البیان، ج ۱ ص ۶۹۳۔

[5] ثواب الاعمال ص ۱۳۳۔

[6] تفسیر نمونہ ج ۲۷ ص ۴۵۴۔

ذہن کو قوت بخشنے والے معنوی اور مادی طریقوں کو احادیث اور آیات کی روشنی میں بیان کیجئے؟

مختصر جواب

جو امور حافظہ اور سمجھ کو قوت بخشتے ہیں وہ چند قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

الف) معنوی امور:

۱۔ خدا کو یاد کرنا (عبادت اور شرعی فرائض کو انجام دینا خصوصا اول وقت کی نماز)

۲۔ ان دعاؤں کو پڑھنا جو حافظہ کی قوت کیلئے مؤثر ہیں، جیسے وہ دعا جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیر المؤمنیں کو حافظہ کی قوت بڑھانے کیلئے تعلیم دی ہے: سبحان من لا یعتدی علی اھل مملکتہ، سبحان من لا یاخذ اھل الارض بالوان العذاب، سبحان الرؤف الرحیم، اللھم اجعل لی فی قلبی نورا و بصراً و فھماً و علماً انك علی کل شیء قدیر [i]

۳۔ قرآن مجید کی تلاوت خصوصاً آیۃ الکرسی۔

۴، جو چیزیں بھول جانے کا سبب بنتی ہیں ان سے دوری اختیار کرنا۔ جیسے معصیت اور گناہ۔

۵۔ بے چین رہنے سے دوری اختیار کرنا اور اپنے اندر اطمینان اور سکون پیدا کرنا۔

۶۔ذہنی مصروفیات کوکم کرنا۔

۷۔التفات اورتوجہ کی قوت کو بڑھانا۔

ب)امور مادی کا خیال رکھنا۔

ا۔طبیعی اور اعضاء کی ضرورتوں کو پورا کرنا (مناسب غذا کا استعمال، کسرت کرنا، عام صحت کا خیال رکھنا)

۲۔مسواک کرنا۔

۳۔گلکوز کی کثرت والے مواد کا استعمال کرنا (جیسے خرما، شہد، قدرتی مٹھائیوں کا استعمال)

۳۔کلشیم، فاسفورس اور ویٹامین کے حامل مواد کا استعمال کرنا۔ جیسے دودھ سے بنی ہوئی چیزیں، مچھلی کا تیل، سنگترہ، ٹماٹر، گندم کا چھلکا، تازہ سبزیاں، گاجر، اور کلیجی۔

۴۔مطالب کی مشق اور تکرار کرنا۔

ج)ماہرین نفسیات کے کہنے پر عمل کرنا۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں: مندرجہ ذیل طریقوں س سے ہم اپنے حافظے کی قوت کو بڑھا سکتے ہیں۔

ا۔تقطیع کرنا، ۲۔معنی دار بنانا، ۳۔نظام دینا۔ ۴۔ بناوٹ ایجاد کرنا۔ ۵۔ پس ختام کا طریقہ۔

[i] مفاتیح الجنان، فصل اول، باب اول، تعقیبات نماز۔

تفصیلی جوابات

جوامور حافظہ اور سمجھ کوقوت بخشتے ہیں وہ چند قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

(الف) معنوی امور:

۱۔ خدا کو یاد کرنا (عبادت اور شرعی فرائض کو انجام دینا خصوصا اول وقت کی نماز)

۲۔ ان دعاؤں کو پڑھنا جو حافظہ کی قوت کیلئے مؤثر ہیں، معصوم امام سے منقول ہے کہ خداوند متعال سے چاھو کہ تمہاری عقل کو تیز بنائے اور خداوند متعال سے فہم اور سمجھ زیادہ ہونے کی دعا کرو۔ [1]۔ نمونہ کے طور پر حافظہ کی قوت کے لئے چند دعاؤں کو نقل کرتے ہیں:

i۔ یہ دُعا جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر المؤمنیں کو حافظہ کی قوت بڑھانے کے لئے تعلیم دی ہے: سبحان من لا یعتدی علی اهل مملکته، سبحان من لا یاخذ اهل الارض بالوان العذاب، سبحان الروف الرحیم، اللهم اجعل لی فی قلبی نوراً و بصراً و فهماً و علماً انك علی کل شیء قدیر [2]

ii۔ سید ابن طاؤوس نقل کرتے ہیں کہ دل کو زندہ کرنے کے لئے اس دعا کو تین مرتبہ پڑھیں۔ یا حی یا قویم یا لا اله الا انت اسئلك ان تحی قلبی اللهم صلی علی محمد و آل محمد [3]

iii۔ مطالعہ کرنے کے وقت کی دعا:

اللهم اخرجنی من ظلمات الوهم و اکرمنی بنور الفهم اللهم افتح علینا ابواب رحمتك و انشر علینا خزائن علومك برحمتك یا ارحم الراحمین۔ [4]

iv۔ نماز صبح کے بعد اس سے پہلے کہ کلام کرے یہ دعا پڑھے: یا حی یا قیوم فلا یفوت شیئاً علمه و لا یؤده [5]

۳۔ قرآن پڑھنا خصوصاً آیۃ الکرسی۔

۴۔ جو چیزیں نسیان او بھول جانے کا سبب بنتی ہیں ان سے دوری اختیار کرنا، جیسے

معصیت، گناہ، دنیا سے زیادہ وابستگی اور دوستی، دنیاوی کاموں میں حد سے زیادہ مصروف رہنا۔ اور دنیاوی مسائل کیلئے غمگین اور محزون رہنا۔ [6]

۵، مطالعہ کے وقت بے چینی کو کم کرنا، آرام اور سکون حاصل کرنا۔

٦۔ ذہنی مصروفیات کو کم کرنا۔

۷۔ توجہ اور التفات کو قوت بخشنا۔

نکتہ:

جو کچھ حافظہ کی قوت کیلئے دعائیں اور روایات بیان ہوئی ہیں وہ کامل سبب (علت تامہ) محسوب نہیں ہوتی ہیں۔ حافظہ اور ذہن کو بڑھانے کے لئے بعض اسباب ہمارے اختیار میں نہیں ہے اور وہ وراثت اور جنٹک (Genetic) سے متعلق ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ ہر انسان کا حافظہ اور ذہنی قوت مختلف وراثتی اور ماحولیاتی اسباب سے متعلق ہے۔ جن میں بعض اسباب ہمارے اختیار میں ہیں اور جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض انسانی طاقت سے باہر ہیں، جیسے دادا اور پر داداؤں کے جینز اور نسلی حالت، پس یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ مذکورہ کاموں کو انجام دینے سے کہ جو بے شک اثر بھی رکھتے ہیں کوئی معجزہ ہوجائے اور دفعتا آپ کا ذہن اور ہوش کی میزان ۹۰ سے ۱۳۰ ہوجائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو ائمہ طاہرین علیہم السلام کے اوامر پر اعتقاد کم ہوجاے گا۔

ہاں البتہ ایک ۱۰۰ نمبر ذہن اور ہوش کو قوت بخشا جاسکتا ہے تاہم یہ کام نشوونما کے خاص دور میں جیسے ماں کے پیٹ میں اور بچپن کے ابتدائی دور میں بچے اور ماں کو بہتر غذا اورکھانے کے صحیح پروگرام میں، اور اسی طرح بچے کی نشو ونما کے ماحول کو صحیح محرکات فراہم کرنے سے بھی بچے کی فکری توانائی کو زیادہ کیا جاسکتا ہے لیکن جوانی اور درمیانہ سال میں زیادہ تر اس کے بارے میں سوچنا چاہئے کہ ذہانت کی رکاوٹوں کو ختم کیا جائے اور اس کیلئے

کشادگی اور قابلیت کے اسباب فراہم کئے جائیں تا کہ جو کچھ خداوند متعال نے انسان کی خلقت میں قرار دیا ہے وہ ظاہر ہوجائے اور یہ روایات اور نصیحتیں زیادہ تر اسی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

(ب) مادی امور کا خیال رکھنا۔

۱۔طبیعی اور فیزالوجی ضرورتوں کو مہیا کرنا (جیسے مناسب غذا، کسرت، صحت عامہ کا خیال رکھنا)

۲۔مسواک کرنا۔

۳۔گلوکوز کی کثرت والے مواد کا استعمال کرنا (جیسے خرما، شہد، قدرتی مٹھائیوں کا استعمال) کلشیم ، فاسفورس اور ویٹامین کے حامل مواد کا استعمال کرنا۔ جیسے دودھ سے بنی ہوئی چیزیں، مچھلی کا تیل، سنگترہ، ٹماٹر، گندم کا چھلکا، تازہ سبزیاں، گاجر، اور کلیجی کا کھانا۔

کتاب مفاتیح الجنان میں آیا ہے: ناشتے میں انگور کا کھانا، خصوصا اگر سرخ اور ۲۱ دانوں کے برابر ہو، حلوا کھانا، گردن کا گوشت، شہد اور مونگ کا کھانا، حافظہ کو قوت بخشنے کے لئے مفید ہے۔[7]

۴۔مطالب کی مشق اور تکرار کرنا۔ (یہ بہت اہم ہے)

۵۔ ہر ۴۵ منٹ مطالعہ کرنے کے بعد دس منٹ آرام کرنا۔

۶ ۔سانس لینے کی مشق کرنا، اس تمرین کو انجام دینے کیلئے کافی ہے کہ کھڑے ہوکر یا سونے کی حالت میں پھیپھڑوں کو ہوا سے بھر کر آہستہ سے سانس واپس کریں۔

(ج)ماہرین نفسیات کے کہنے پر عمل کرنا۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں: مندرجہ ذیل طریقوں س سے ہم اپنے حافظے کی قوت کو بڑھا سکتے ہیں۔

۱۔ تقطیع (حصوں میں بانٹنا): یعنی حروف کو الفاظ کے قطعات (حصوں میں)، اور الفاظ کے قطعات (حصوں) کو عبارات کے قطعات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اسی تقطیع کے ذریعے ہم حروف یا اَرقام کو معنی دار قطعات میں تبدیل کرسکتے ہیں اور اپنے حافظہ کی ظرفیت کو زیادہ کرسکتے ہیں، جیسے اعداد ۹۱۴۹۔۔۷۷۔۔۲۱۷۔۔ ۶۱۹۔۔ ۸۳ کی زنجیر کو ۱۹۸۳۔۔۔ ۱۱۷۶۔۔ ۱۴۹۲ (جوکہ عیسوی سال ہیں) میں تبدیل کرسکتے ہیں اور اس طرح اپنے حافظہ کو قوت بخش سکتے ہیں۔

۲۔ معنی دار بنانا: یہ طریقہ اور طریقوں سے زیادہ حافظہ کو قوت بخشتا ہے اور جتنا بھی معنی گہرا اور زیادہ جزئیات کے ساتھ کوڈ میں رکھا جائے گا اتنا ہی زیادہ دیر تک اور بہتر طریقہ پر یاد میں رہتا ہے، پس جب کسی کتاب کا کوئی نکتہ یاد کرنا چاہتے ہو تو اس کی یاد آوری اس صورت میں زیادہ ممکن ہے کہ اس کے الفاظ کی بہ نسبت معنی کی طرف زیادہ توجہ کی جائے، جتنا بھی گہرے اور کامل طور پر معنی پر توجہ کریں اس کو اتنا ہی زیادہ بہتر یاد کرسکتے ہیں۔

۳۔ نظم دینا: مطالب کو منظم کرکے انہیں آسانی سے یاد کیا جاسکتا ہے، انہیں حفظ کرکے دوبارہ یاد کیا جاسکتا ہے، یعنی کسی موضوع کو حفظ اور یاد کرنے کے لئے اور اس مطلب کو جس کے نیچے اور مطالب اور مختلف شاخیں ہیں انہیں ایک منطقی نظم میں لاکر کل سے جزء تک اور اوپر سے نیچے کی جزئی شاخوں میں تقسیم کرکے حفظ کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ بناوٹ (نسیج): ہم عام طور پر ایسے مطالب کو سیکھتے ہیں جو ایک خاص زمان اور مکان میں ہوتے ہیں ان شرائط کو جو سیکھنے کے وقت اس ماحول میں موجود ہوتے ہیں انہیں بناوٹ اور نسیج کھا جاتا ہے۔ اس وقت آسانی سے ان مطالب کو دوبارہ یاد میں لا سکتے ہیں جب یاد دلانے کی بناوٹ کو اسی طرح قرار دیں جو یاد کرنے کے وقت موجود تھی، مثال کے طو پر اگر آپ اپنے مڈل سکول کے ہم جماعتوں کے ناموں کو یاد کرنا چاہتے ہوں تو اس مدرسے

کی غلام گردش میں قدم رکھیں جس میں آپ مڈل میں پڑھتے تھے، ان ہم جماعتوں کے ناموں کو یاد کر لینے میں آسانی ہوتی ہے۔

۵۔ پس ختام کا طریقہ: یہ طریقہ جو ایک طالب علم کو اپنی درسی کتابوں کے مطالب کو حفظ کرنے میں مدد دیتا ہے اس کا نام پس ختام طریقہ رکھا گیا ہے، اس طریقے کا نام چھ مرحلوں کے ابتدائی حروف، ا۔ پیش خوانی (پ)، ۲۔ سوال کردن (س) سوال کرنا۔ ۳۔ خواندن (خ) پڑھنا۔ ۴۔ تفکر (ت) فکر کرنا۔ ۵۔ از حفظ کردن (ا) حفظ کرنا۔ ۶۔ مرور کردن (م) دورہ کرنا سے تشکیل پایا ہے۔

وضاحت

فرض کیجئے آپ کسی کتاب سے کوئی مطلب ذہن کے سپرد کرنا چاہتے ہیں اور پھر اسے یاد میں لانا چاہتے ہیں۔ تو ابتدا میں ایک پیش مطالعہ کر کے اہم موضوع سے آگاہی حاصل کریں گے اس طرح کا پیش مطالعہ کرنا سبب بنتا ہے کہ اس فصل کے مطالب کو آپ منظم کریں گے۔ (جیسا کہ بیان ہوا) دوسرے اور تیسرے مرحلہ میں: آپ ہر حصے سے بعض سوال پیدا کریں اور پڑھیں تیسرے مرحلے میں ہر حصے کو سوالات کی جواب دہی کیلئے پڑھیں۔ چوتھے مرحلے میں پڑھتے وقت، سوالات پیدا کر کے اور آگاہی سے رابطہ قائم کر کے آپ مطلب کے بارے میں سوچئے اور پڑھے گئے مطالب کو معنی دیجئے پھر پانچویں اور چھٹے مرحلے میں یعنی حفظ سے مطالب کو کہنے میں اور دورہ کرنے میں آپ کو کوشش کرنی چاہئے کہ جن مطالب کو پڑھا ہے ان کی حقیقت کو یاد کریں اور اپنے پیش آمدہ سوالات کا جواب دیں۔[8]

مزید اطلاع کے لئے سوال نمبر ۸۰۸، مطالعہ کے شرائط اور دعا کی طرف رجوع کریں۔

حواشی

[1] بحارالانوار، ج ۱ ص ۲۲۴۔ روایت ۱۷۔ روایت عنوان بصری۔

[2] مفاتیح الجنان، فصل اول، باب اول، تعقیبات نماز۔

[3] ایضا: کتاب باقیات صالحات۔

[4] ایضا

[5] ایضاً

[6] ایضاً

[7] ایضا۔

[8] اپرسمان سی دی سے اقتباس، تھوڑی تبدیلیاں لاکر اور دوبارہ لکھا گیا ہے۔

آخرت میں اندھے پن کے کیا معنی ہیں؟

مختصر جواب

اس آیہ شریفہ [i] اور اس کی مشابہ [ii] دوسری آیات میں اعمی سے مراد دنیا میں جسمانی اندھا پن نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ شخص دانستہ طور پر اپنے آپ کو اندھا بنائے، یعنی خدا کے جلوؤں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت کو دیکھتا ہے اور حق وحقیقت تک پہنچتا ہے، لیکن دل سے ان کا معتقد نہیں ہوتا ہے، جیسے کہ اصلا اس کی آنکھوں نے ان آثار اور عظمتوں کو نہیں دیکھا ہے. وہ دینی مسائل کے ساتھ ایسا برتاؤ کرتا ہے، جیسا کہ نہ انہیں دیکھا ہے اور نہ انہیں سنا ہے، لہٰذا حق بات کہنے اور اس کے اقرار کرنے سے بھی اجتناب کرتا ہے اور قرآن مجید کی تعبیر میں یہ (دانستہ طور پر) اندھا، بہرا اور گونگا ہے.

آخرت کی اکثر سزائیں تجسم اعمال کی صورت میں ہیں، اس کا قلبی اندھا پن نمایاں ہو کر اس کے لئے عذاب وتکلیف کا سبب بن جاتا ہے، محشر میں جہاں آیات الٰہی اور مومنین جلوہ گر ہیں وہ اندھا ہے اور حق کے دل ربا جمال، مومنین کے نورانی چہرے اور بہشتی نعمتوں کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے اور بہشت کی طرف جانے کے کسی راستہ کو نہیں پا سکتا ہے. لیکن اس کے جہنم میں داخل ہونے کے بعد اس کے عذاب میں شدت پیدا ہونے کے لئے، مختلف عذاب اور عذاب میں مبتلا جہنمیوں کو دیکھنے کے لئے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، چونکہ دنیا میں بھی ایسا ہی تھا کہ حق وحقیقت کے سامنے وہ اپنی آنکھوں کو بند کر لیتا تھا اور باطل، دنیا اور

دنیا پرستوں کے لئے اپنی آنکھیں کھولے رکھتا تھا۔

پس اس سے ادراک سلب نہیں ہوتا تھا، بلکہ قیامت کے دن سب کا ادراک اپنے کمال تک پہنچتا ہے اور سب غیبی امور کے بارے میں، جیسے خدا کا وجود، وحی، ملائکہ، بہشت و جہنم و... عین الیقین تک پہنچتے ہیں اور کسی شخص کے لئے ان امور کے سلسلہ میں انکار وشبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

[i] وَمَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾ جو اس دنیا میں اندھا ہے، آخرت میں بھی اندھا ہوگا بلکہ گمراہ تر، اسراء۔۷۲۔

[ii] وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾، طہ، ۱۲۴و۱۲۵۔

تفصیلی جوابات

انسان کا ڈھانچہ مختلف ابعاد اور توانائیوں کا حامل ہے، جن میں سے بعض ظاہری اور حسی ہیں اور بعض باطنی اور انسان کی روح سے مربوط ہیں، لیکن ظاہری توانائیاں، بدن کی نوکر اور لذتوں اور بدن کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے اوزار ہونے کے علاوہ (جیسا کہ حیوان میں بھی یہی ذمہ داریاں رکھتی ہیں) دل تک اطلاع پہنچانے کی راہ اور معارف کسب کرنے اور جذبات و احساسات کو ابھارنے والی بھی ہیں، اس لحاظ سے انسان کی پوری زندگی میں اس کو سمت دی ہیں۔ اب اگر انسان ان حسی نعمتوں، خاص کر آنکھ اور کان، سے پورا استفادہ کرے اور ان دو اوزاروں کا صحیح استعمال کرے اور اپنی انسانیت کی بلند راہ میں ان سے بہرہ مند ہو جائے، تو اس کو سمیع و بصیر کہا جا سکتا ہے، (نہ کہ صرف سننے اور دیکھنے والا) لیکن اگر ان نعمتوں سے صحیح استفادہ نہ کرے اور ان سے حاصل ہونے والے معارف کے بارے میں ان سنی اور ان دیکھی کا مظاہرہ کرے اور ان معارف کے سلسلہ میں اقرار کی زبان نہ کھولے تو گویا وہ

سننے اور دیکھنے والا نہیں تھا، کیونکہ اس کی آنکھوں اور کان کا وہ فائدہ نہیں ہے جو اس کی حیات طیبہ کے لئے ہونا چاہیے تھا اور یہ عدم فائدہ اس کی آنکھوں اور کان میں عیب کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ یہ ان نعمتوں کے بارے میں اس کے اختیار کا غلط استفادہ اور عدم بیداری و تذکر کا نتیجہ ہے.

اس لحاظ سے، ممکن ہے کہ انسان، خدا و خالقیت اور اس کی رحمت و عنایات کے قرائن کا مشاہدہ کرتا ہے، لیکن خدا پر ایمان نہیں لاتا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے قرائن اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کو دیکھتا ہے، لیکن ان کی تصدیق نہیں کرتا ہے اور ان کے فرمودات کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا ہے، ولی علیہ السلام کے بارے میں نبی اکرم (ص) کے نصوص کو سنتا ہے اور ان کی عظمتوں اور فضائل کو پاتا ہے، لیکن ان کا انکار کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ولی کی ولایت کو مسترد کرتا ہے اور ولایت کے تحت نہیں آتا ہے بلکہ اس کے ساتھ جنگ کرتا ہے، یا خدا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تذکروں کی توجہ اور ان کی صداقت، معاد کے ضروری ہونے کی علامتوں کے باوجود ابدی، بہشتی اور جہنمی زندگی کے وجود کا انکار کرتا ہے... اگر کسی نے دنیا میں اپنی پوری عمر میں اس طرح کی زندگی بسر کی اور اپنی آنکھوں کو انسانیت و معنویت کی طرف سے بند رکھا اور ان سے منہ موڑ لیا اور خدا اور اس کے رسول (ص) کی اطاعت اور ولی کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، تو وہ آخرت میں بھی، جو تجسم اعمال پرکھنے اور جزا و سزا پانے کی جگہ ہے، کبریائے حق جل جلالہ کے دلربا جمال اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیائے خدا اور مومنین کی ملکوتی صورتوں اور بہشتی نعمتوں کا مشاہدہ کرنے سے محروم رہے گا اور جہنم میں داخل ہوگا اور جس طرح دنیا میں دل کے اندھے پن کی وجہ سے سعادت کے راستے میں آگے نہ بڑھ سکا، آخرت میں بھی اندھا محشور ہوگا اور بہشت کو پانے سے محروم ہوگا.

قرآن مجید میں قیامت میں اندھے پن کے اسباب وعلل کے طور پر مندرجہ ذیل امور دینوی عوامل،وعلل کے طور پر ذکر ہوئے ہیں:

خدا کا انکار اور محض دنیاداری اور نفسانی خواہشات کی پرستش،[1] دین کے امور میں ہٹ دھرمی اور بہانہ تراشی،[2] آخرت کو فراموش کرنا اور اس پر اعتقاد نہ رکھنا،[3] لوگوں کو دین سے روکنا اور خدا پر افترا باندھنا،[4] آیات الٰہی کو جھٹلانا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبول نہ کرنا،[5] قطع رحم (اور ولیؑ کی ولایت کو قبول نہ کرنا اور سرکشی وعصیان،[6] اس کے علاوہ روایات میں بھی اندھے پن اور حق کو نہ دیکھ پانے کے مندرجہ ذیل امور،مصادیق کے عنوان سے بیان کئے گئے ہیں:امام علی علیہ السلام کی ولایت کا انکار اور استطاعت کے باوجود مرتے دم تک واجب حج بجا نہ لانا،[7] البتہ روایات میں آیات کے بارے میں بھی اشارہ ہوا ہے.

آخرت میں اندھا پن اس معنی میں نہیں ہے کہ شخص ہر قسم کے ادراک سے محروم ہو،جیسا کہ دنیا میں بھی ایسا ہی ہے .وہ محشر میں اپنے اندھے پن کا ادراک کرتا ہے اور اس مطلب کی طرف بھی متوجہ ہے کہ یہ دنیا کی سرائے کے علاوہ ایک اور سرائے ہے وہاں پر آنکھیں رکھتا تھا اور یہاں پر ان سے محروم ہے .اس لئے اعتراض کی زبان کھولتا ہے،جس طرح دنیا میں ہٹ دہرمی اور اعتراض کرنے کا عادی تھا.[8]

لیکن قرآن مجید کے ظاہر اور بعض روایات اور مفسرین کی تحقیقات سے جو معلوم ہو تا ہے،وہ یہ ہے کہ: قیامت میں متعدد توقف گاہیں ہیں تا کہ سرانجام بہشتی،بہشت کی طرف راہی ہو جائیں اور جہنمی،دوزخ میں ڈال دیئے جائیں،اور اس گروہ کا اندھا پن محشر کی توقف گاہوں سے متعلق ہے،تا کہ جہنم میں داخل ہونے سے پہلے خداوند متعال کے جلال و جبروت اور اولیائے الٰہی کو دیکھنے سے محروم رہے،لیکن جہنم میں داخل ہونے کے بعد اس کی آنکھیں

کھل جاتی ہیں،تا کہ اولیائے خدا کو نہ دیکھنے اور عذاب میں مبتلا جہنمیوں کو دیکھنے سے اس کے عذاب میں اضافہ ہو جائے!

بعض تنگ نظروں نے خیال کیا ہے کہ وَمَنۡ كَانَ فِيۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى سے مراد دنیا میں جسمانی اندھا پن ہے،یعنی جو دنیا میں اندھے ہیں، جتنے بھی بصیر اور فقیہ ہوں،آخرت میں اندھے محشور ہوں گے .جب کہ آیت کا مقصد ایسا نہیں ہے اور فِيۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى سے مراد دنیا میں ان کا اندھا پن ہے لیکن **فهو فی الاخره اعمی** سے مراد ظاہری اندھا پن اور اس کے چہرے پر دل کے اندھے پن کا ظہور اور تجسم ہے تا کہ اس کے عذاب کا سبب بنے .اور جیسا کہ بیان کیا گیا، یہ محشر میں اس کا اخروی اندھا پن ہے،لیکن جہنم میں داخل ہونے کے بعد تمام عذاب اور اس کے مجسمہ اعمال پر اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں تا کہ زیادہ عذاب میں مبتلا ہو جائے،جس طرح وہ دنیا میں عمل کرتا ہے،یعنی وہ خدا کی نشانیوں اور اولیائے الٰہی کے مقابلہ میں آنکھیں بند کرتا تھا اور دنیا کے سرمایہ اور اپنے ہم مسلکوں کو دیکھتا تھا.**اعاذنا الله وایاکم من شرور انفسنا.**

منابع وماخذ

١.جوادآملی،عبداللہ فطرت در قرآن،ج١٢،اسراء،قم طبع دوم ٢٠٠٠ء،ص٩٧.١٠٤و١٣٩.١٤٠.

٢.جوادی آملی، عبداللہ،معرفت شناسی در قرآن،ج١٣،اسراء،قم،طبع دوم١٩٩٢ء،ص٣٥٧.٣٦٢.

٣.طباطبائی،سید محمد حسین،المیز ان (فارسی)،دفتر انشارات اسلامی،قم، ج١٣، ص٢٣٢.٢٣٣وج١٤،ص٣١٤.٣١٦.

٤.طیب،سید عبدالحسین،اطیب البیان،ج٨،کتابفروشی اسلامی،تہران،طبع

دوم، ص ۲۸۷. ۳۸۸.

۵. قرائتی، محسن، تفسیر نور، در راه حق، قم، طبع اول ۲۰۰۵ء مذکورہ آیات کے ذیل میں حاشیہ.

٦. قمی مشہدی، محمد بن محمد رضا، کنز الدقایق، مؤسسہ طبع ونشر (وزارت ارشاد)، تہران. طبع اول، ۱٤۱۱ھ. ج ۷، ص ٤٦۳ و ٥۲٤. ٥۲۳ و ج ۸، ص ۳۷۱. ۳۸٦.

۷. مکارم، ناصر، تفسیر نمو نہ، دار الکتب الاسلامیہ، تہران، طبع، ۱۷، ۲۰۰۵ء مذکورہ آیات کے ذیل میں حاشیہ میں.

حواشی

[1] طہ، ۔ ۱۲٤۔ ۱۲۷. اسراء۔ ۷۲. ۹۷

[2] فصلت۔ ۱۷

[3] نمل۔ ٦٦

[4] ہود۔ ۱۸ و ۲۸

[5] انعام۔ ٥ و ٤. اعراف۔ ٦٤. بقرہ۔ ۱۸ و ۱۷

[6] محمد۔ ۲۲ و ۲۳

[7] ملاحظہ ہو: اطیب البیان، ج ۱۸، ص ۲۸۷ و ۲۸۸ المیز ان، ج ٤، ص ۳۱٤ کنز الدقایق، ج ۷، ص ٥۲٤، ٥۲۳ و ٤٦۲، ٤٥٦ و ج ۸، ص ۳۷۱، ۳٦۸

[8] طہ۔ ۱۲۷، ۱۲٤

عبداللہ بن ابی سرح کے تغییر قرآن کی داستان کے باوجود قرآن مجید کی عدم تحریف کیسے سازگار ہوسکتی ہے؟

اگر قرآن مجید میں تحریف نہیں ہوئی ہے تو تاریخ میں کیوں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید پڑھتے وقت بعض اوقات کلمات کو بدلتے تھے؟ حتی تاریخ میں یہ بھی آیا ہے کہ کاتبان وحی میں سے ایک شخص اس سلسلہ میں مرتد ہوا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے سزائے موت دیدی؟ کیا یہ روایتیں صحیح ہیں؟

مختصر جواب

جن روایتوں کے بارے میں آپنے اشارہ کیا ہے وہ عبداللہ بن ابی سرح کے مرتد ہونے کی داستان سے مربوط ہیں۔ اس شخص کے ارتداد کی کیفیت اور علت کے بارے میں تین قسم کی روایتیں نقل کی گئی ہیں:

اولاً: اس کے ارتداد کی کیفیت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض روایتیں قرآن مجید کی تحریف اور تغییر کے سلسلہ میں کسی قسم کی دلالت نہیں کرتی ہیں۔ ان میں بعض روایتیں مبہم اور مجمل ہیں۔ صرف چند مختصر روایتوں کے مطابق قرآن مجید کی تحریف اور تغییر میں ایک قسم کی دلالت پائی جاتی ہے، لہٰذا یہ روایتیں قابل استناد نہیں ہیں۔

ثانیاً: تیسرے گروہ سے مربوط روایات بھی، مرحوم شیخ صدوقؒ کی تفسیر کے مطابق

تحریف پر دلالت نہیں کرتی ہیں ۔ انہوں نے جملہ ہو واحد کے بارے میں، جو تیسرے گروہ کی ان روایتوں میں، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے، لکھتے ہیں: یعنی خواہ تم اس میں تغیر دو گے یا نہ دو گے جو کچھ میں املا بیان کرتا ہوں وہ لکھا جاتا ہے نہ وہ جسے تم تغیر دیتے ہو۔

ثالثاً: اگر ہم مرحوم شیخ صدوق کی تفسیر اور توجیہ کو قبول نہ کریں اور اسی حالت میں سند کے لحاظ سے بھی ان روایات کو صحیح جان لیں، پھر بھی چونکہ اس قسم کی روایتیں قرآن مجید سے تضاد رکھتی ہیں، اس لئے قابل استناد نہیں ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے دستورات کے مطابق اس قسم کی روایتوں کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔

آخری نکتہ یہ کہ عبداللہ بن ابی سرح نے، مرتد ہونے کے بعد، مکہ فرار کیا اور فتح مکہ کے وقت بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (خلیفہ) عثمان کی شفاعت کی وجہ سے اسے سزائے موت نہیں دیدی اور وہ عثمان کی خلافت کے زمانہ میں مصر میں ان کا گورنر مقرر ہوا ہے۔

قابل توجہ بات ہے کہ اس روایت پر سنجیدگی سے غور کرنے کے نتیجہ میں معلوم ہوتا ہے کہ، یہ روایت تحریف قرآں پر دلالت کرنے کے بجائے، عدم تحریف پر دلالت کرتی ہے، کیونکہ قرآن مجید کی عدم تحریف کے قایلین، مخالفین کی تحریف کی کوششوں کی نفی نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کی اس تلاش میں کامیابی کی نفی کرتے ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ، اولاً: قرآن کے تحفظ کی ضمانت خداوند متعال نے دی ہے

۔

ثانیاً: قرآن مجید کی تحریف اور تغییر کے سلسلہ میں خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محافظ اور نگہبان تھے۔ ابن ابی سرح کی طرف سے یہ اقدام ان باطل اور ناکام کوششوں کے مصادیق میں سے ہے، جن کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقابلہ کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سازشوں کو ابتدا میں ہی نابود کر کے رکھ دیا تھا۔ حقیقت میں جو شخص اس روایت کے

بارے میں سنجیدگی اور گہرائی سے غور کرے تو وہ واضح طور پر سمجھ سکتا ہے کہ یہ روایت قرآن مجید کی عدم تحریف پر دلالت کرتی ہے، نہ تحریف پر۔

تفصیلی جوابات

جواب کے واضح ہونے کے لئے مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کرنا ضروری ہے:

اول: قرآن مجید کی عدم تحریف وتغییر قطعی و محکم ادلہ کے استناد پر ہے کہ ان کے بعض عقلی ادلّہ پچھلے سوالات میں بیان کئے گئے ہیں، [1] یہاں پر ہم بعض دوسرے ادلّوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید کی بعض آیات بیان کرتی ہیں کہ قرآن مجید قابل تحریف وتغییر نہیں ہے بلکہ اس میں تحریف وتغییر ناممکن ہے: اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے:

جس کے قریب، سامنے یا پیچھے کسی طرف سے باطل آ بھی نہیں سکتا ہے کہ یہ خدائے حکیم وحمید کی نازل کی ہوئی کتاب ہے۔ [2] اور یہ قرآن کسی غیر خدا کی طرف سے افترا نہیں ہے بلکہ اپنے ماسبق کی کتابوں کی تصدیق اور تفصیل ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے، یہ رب العالمیں کا نازل کردہ ہے۔ [3]

۲۔ وہ آیات جو جداگانہ طور پر وحی کو حاصل کرنے، اس تحفظ اور ابلاغ کے سلسلہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت کو بیان کرتی ہیں:

الف: وحی کو حاصل کرنے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت: اس سلسلہ میں ارشاد الٰہی ہے: اور آپ کو یہ قرآن خدائے علیم وحکیم کی طرف سے عطا کیا جارہا ہے [4]۔

ب۔ قرآن مجید کی حفاظت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت: اس سلسلہ میں ارشاد ہے: ہم عنقریب تمہیں اس طرح پڑھائیں گے کہ بھول نہ سکو گے۔ [5]

ج۔ تلاوت وابلاغ کے مقام پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت: پیغمبر، ان پر آیات

الٰہیہ کی تلاوت کرتا ہے۔ [6] یا یہ کہ ارشاد فرماتا ہے: وہ اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتا ہے، اس کا کلام وہی وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے [7]

بلکہ خداوند متعال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو انتباہ کرتا ہے کہ اگر وحی میں کسی قسم کی تھوڑی سی بھی تغییر انجام دیں تو انہیں بدترین عذاب سے دوچار کرے گا:

اور اگر یہ پیغمبر ہماری طرف سے کوئی بات گڑھ لیتا تو ہم اس کے ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر اس کی گردن اڑا دیتے پھر تم میں سے کوئی مجھے روکنے والا نہ ہوتا۔ [8]

۳۔ وہ آیات جو بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید میں کسی قسم کی تغییر و تبدیلی کا حق نہیں رکھتے ہیں: اس سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔۔۔تو آپ کہہ دیجئے کہ مجھے اپنی طرف سے بدلنے کا کوئی اختیار نہیں ہے میں تو صرف اس امر کا اتباع کرتا ہوں جس کی میری طرف وحی کی جاتی ہے [9]۔

٤۔ وہ روایات جن سے عدم تحریف اور تغییر کا استفادہ کیا جاتا ہے: اس سلسلہ میں ہم نمونہ کے طور پر صرف ایک روایت کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں تم میں دو گراں قیمت چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، کتاب خدا اور میری عترت اہل بیتؑ۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس پہنچیں گے۔ [10]

یہ روایت، جسے شیعہ اور سنی دونوں قبول کرتے ہیں، بیان کرتی ہے کہ قرآن مجید قیامت تک استناد کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور لوگوں پر حجت ہے۔ واضح ہے کہ اگر قرآن مجید قابل تحریف و تغییر ہوتا، تو استناد اور دین کا منبع ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

دوم: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام سے متعدد روایتیں نقل کی گئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کو قبول یا مسترد کرنے کا معیار ان احادیث کا قرآن مجید کے

موافق یا مخالف ہونا ہے۔

ہم ذیل میں ان احادیث کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو چیز کتاب خدا کے موافق ہو اسے قبول کرو اور جو چیز قرآن مجید کے موافق نہ ہو اسے قبول نہ کرنا۔ [11]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ہم سے کوئی حدیث قبول نہ کرنا، مگر یہ کہ وہ قرآن کے موافق ہو اور جو بات ہمارے پروردگار کے کلام کے مخالف ہو اسے قبول نہ کرنا۔ [12]

نتیجتاً، جن روایتوں کے بارے میں آپ نے اشارہ کیا ہے، اگر وہ سند و دلالت اور مفہوم و محتوی کے لحاظ سے صحیح ہوتیں تو قابل قبول تھیں، لیکن یہ روایات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے دستورات کے مطابق قرآن مجید کی متعدد آیات کے مخالف ہیں اس لئے انہیں قبول نہیں کرنا چاہئے اور استناد کے ل ح اظ سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے

سوّم: جن روایتوں کے بارے میں آپنے اشارہ کیا ہے، وہ عبد اللہ بن ابی سرح کے ارتداد کی داستان سے مربوط ہیں۔

مذکورہ شخص کے ارتداد کی کیفیت اور علت کے بارے میں تین قسم کی روایتیں نقل ہوئی ہیں:

الف۔ بعض روایتوں میں یوں آیا ہے: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سورہ تین کی آیات کو اس (عبداللہ بن اسرح) کے لئے املا فرمایا اور وہ لکھتا تھا۔ یہاں تک آیہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ پر پہنچ گئے۔ ابن ابی سرح خداوند متعال کے انسان کو خلق کرنے کی کیفیت پر حیرت میں پڑ گیا اور کہا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآہ وسلم نے فرمایا: لکھو فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾۔ اور یہی بات ابن ابی سرح کے دل میں وسواس پیدا ہونے کا سبب بنی اور اس نے اپنے آپ سے کہا اگر حقیقت میں یہ وحی ہے، تو

مجھ پر بھی وحی نازل ہوتی ہے ۔ اور اگر جھوٹ ہے تو (نعوذ باللہ) پیغمبرﷺ جھوٹ بولتے ہیں ۔اس لئے وہ مرتد ہوا اور مکہ بھاگ گیا۔[13]

ب۔بعض دوسری روایتوں میں آیا ہے کہ ابن ابی سرح وحی لکھنے کے دوران اس میں کچھ تغیرات ایجاد کرتا تھا اور یہی امر اس بات کا سبب بنا کہ پیغمبر اسلامﷺ نے اسے کتابت کے عہدہ سے معزول کیا اور وہ مرتد ہوکر مکہ بھاگ گیا[14]۔

ج۔فیض کا شانی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے: عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عثمان کا رضاعی بھائی تھا، وہ خوش خط لکھتا تھا، جب بھی رسول خداﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی، اسے بلایا جاتا تھا اور آنحضرتﷺ وحی کو پڑھتے تھے اور وہ لکھتا تھا،لیکن وہ سمیع بصیر کے بجائے سمیع علیم اور بما تعملون خبیر کے بجائے بما تعملون بصیر لکھتا تھا، اور ی کی جگہ پرت اور ت کی جگہ پر ی لکھتا تھا، اس کے باوجود آنحضرتﷺ فرماتے تھے ہو واحد کوئی فرق نہیں ہے یہ سب ایک ہی ہیں سرانجام یہ شخص مرتد ہوا اور مکہ بھاگ گیا اور وہاں پر قریش سے کہا: خدا کی قسم، محمدﷺ نہیں جانتے تھے کہ کیا کہتے ہیں، میں بھی ان کے مانند کہنے کی قدرت رکھتا ہوں اور ان کے مانند آیت نازل کرسکتا ہوں[15]۔

اس کلام کا نتیجہ:

اولاً: یہ روایات چونکہ ارتداد کی کیفیت کے بارے میں اختلاف رکھتی ہیں، اس لئے صحیح طور پر ان سے استناد نہیں کیا جا سکتا ہے، چونکہ پہلی حدیث کے مطابق تغییر و تحریف کے بارے میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے، کیونکہ اس میں کوئی منافات نہیں ہے کہ جو ابی سرح کے دل میں تصور پیدا ہوا وہی وحی الٰہی ہو اور وہی بات اس سے پہلے پیغمبرﷺ کے دل پر نازل ہوئی ہو۔ اور دوسری حدیث مبہم اور مجمل ہے ۔صرف تیسری حدیث تغییر اور تحریف پر دلالت کرتی ہے۔

ثانیاً: مرحوم شیخ صدوقؒ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس کلام و واحد کے بارے میں لکھتے ہیں: یعنی خواہ تم اس میں تغییر ایجاد کرو یا نہ کرو میں جو املا کہتا ہوں وہی لکھا جاتا ہے نہ وہ چیز جو تم تغییر دیتے ہو۔ [16]

پس اگر یہ روایت (یعنی تیسری حدیث کے مطابق) سند کے لحاظ سے درست اور صحیح ہو، تو ایسا لگتا ہے کہ شیخ صدوق کی تفسیر اور توجیہ قابل قبول ہے۔ کیونکہ یہ تفسیر، حقیقت میں قرآن مجید کی آیات کے مطابق ہے، جس میں ارشاد ہوتا ہے: قرآن تغییر اور تحریف کے قابل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ آیات جن میں یہ بیان ہوا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کو وصول کرنے، حفاظت اور ابلاغ کرنے میں معصوم ہیں اور غلطی نہیں کرتے ہیں۔

ثالثاً: اگر ہم مرحوم شیخ صدوق کی تفسیر و توجیہ کو قبول نہ کریں اور سند کے لحاظ سے بھی صحیح ہو، جیسا کہ ہم نے دوسرے نکتہ میں بیان کیا، تو اس قسم کی روایتیں واضح طور پر قرآن مجید کے مخالف ہیں اس لئے استناد کی قابلیت نہیں رکھتی ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار علیہم السلام کے دستورات کے مطابق اس قسم کی روایتوں کو قبول نہیں کرنا چاہئے۔

چہارم: مرتد ہونے کے بعد عبداللہ بن ابی سرح مکہ بھاگ گیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر (خلیفہ سوم) عثمان کی سفارش اور شفاعت کی وجہ سے اسے سزائے موت نہیں دی اور بعد میں وہ عثمان کی خلافت کے دوران مصر کا گورنر مقرر کیا گیا۔ [17]

قابل ذکر بات ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ، یہ روایت تحریف قرآن کی دلالت کرنے کے بجائے عدم تحریف پر دلالت کرتی ہے۔

کیونکہ قرآن مجید کی عدم تحریف کے قائل افراد، تحریف کے سلسلہ میں مخالفین کی کوششوں کی نفی نہیں کرتے ہیں، بلکہ ان کی ان کوششوں میں کامیابی کی نفی کرتے ہیں

اس کی دلیل یہ ہے کہ:

اولاً: قرآن مجید کی حفاظت کی ضمانت خداوند متعال کی طرف سے دی گئی ہے۔

ثانیاً: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید میں تحریف وتغییر کے سلسلہ میں محافظ ونگہبان تھے۔ابن ابی سرح کی طرف سے یہ اقدام ان باطل اور ناکام کوششوں کے مصادیق میں سے ایک مصداق ہے، جن کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقابلہ کرتے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سازشوں کا ابتدا میں ہی گلا گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔حقیقت میں جو شخص اس روایت پر سنجیدگی اور گہرائی سے غور کرے تو وہ واضح طور پر سمجھ سکتا ہے کہ یہ روایت قرآن مجید کی عدم تحریف پر دلالت کرتی ہے، نہ تحریف پر۔

حواشی

[1] ملاحظہ ہو: عنوان: عدم تحریف قرآن،سوال 3843 (سایت: 4112)۔

[2]۔سورہ فصلت،٤٢۔

[3]۔سورہ یونس،٣٧۔

[4]۔سورہ نمل،٦۔

[5]۔سورہ اعلی،٦۔

[6]۔سورہ آل عمران،١٦٤۔

[7]۔سورہ نجم،٣و٤۔

[8]۔سورہ الحاقہ،٤٤ تا ٤٧۔

[9]۔سورہ یونس،١٥۔

[10]۔مسند احمد،حدیث١٠٦٨١،سنن ترمذی،حدیث ٣٧٢،مستدرک حاکم،ج٣،ص١٠٩۔

[11]۔کافی،ج١،ص١٠٩۔

[12]۔بحارالانوار،ج٢،٢٤٩۔

[13]۔ایضاً،ج٢٢،ص٣٤۔

[14]۔تفسیر عیاشی، ج۱،ص۳٦۹۔

[15]۔فیض کاشانی،تفسیر الصافی، ج۲،ص۱٤۰ ذیل آیہ ۹۳،سورہ انعام،تہران،مکتبۃ الاسلامیہ۔

[16]۔صدوق، معانی الاخبار، بہ نقل از بحار الانوار، ج۹۲، باب ۳،ص۳۵۔

[17]۔بحار الانوار، ج۱۷،ص۱۷۸۔

قرآن مجید میں مسلمان کن معنی میں آیا ہے؟

مختصر جواب

قرآن مجید کی اصطلاح میں، مسلمان، خداوند متعال کے فرمان، اور ہر قسم کے شرک سے پاک مکمل توحید کے سامنے مکمل طور پر تسلیم ہونے کے معنی میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کو مسلمان کے عنوان سے معرفی کرتا ہے۔

چونکہ خدا کے حضور، دین، اسلام ہے إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ قف اس لئے جن لوگوں نے خدا کے دین کو اپنے زمانہ میں قبول کیا ہوگا اور الٰہی احکام کے پابند ہوں گے، وہ مسلمان ہیں۔

یعنی قرآن مجید کے مطابق آسمانی ادیان کے تمام پیروکار اپنے زمانہ میں مسلمان تھے اور اس طرح عیسائی اور یہودی وغیرہ، نئے دین کے آنے سے پہلے ان کا دین منسوخ نہ ہونے تک مسلمان تھے، کیونکہ وہ پروردگار عالم کے حضور تسلیم ہوئے تھے اور اگر انہیں یہودی یا عیسائی کہا جاتا تھا وہ ان کے پیغمبروں کی وجہ سے تھا ورنہ جس طرح ہم نے بیان کیا تمام الٰہی ادیان پر اسلام لاگو ہوتا ہے اور وہ صرف شریعت میں فرق رکھتے ہیں۔

البتہ آج مسلمان دین خاتم کے پیروؤں پر لاگو ہوتا ہے، کیونکہ انہوں نے دین اسلام کو قبول کر کے اور تمام انبیاء اور آسمانی شریعتوں پر اعتقاد رکھ کر خدا کے حضور تسلیم ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اس معنی کے مطابق اس وقت دوسرے ادیان کے پیروؤں کو مسلمان نہیں

کہا جاتا ہے، کیونکہ انہوں نے آخری دین کو قبول نہ کر کے خدا کے حضور تسلیم ہونے سے نافر مانی کی ہے اور مسلمان کے وصف اور تسلیم ہونے سے محروم ہو چکے ہیں۔

البتہ حقیقی مسلمان وہ ہے جو احکام و دستورات الٰہی کا قول و فعل سے تسلیم ہو، یعنی زبان سے بھی خدا کی وحدانیت اور انبیاء علیہم السلام اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرے اور عمل سے بھی دینی احکام اور دستورات، من جملہ دوسروں کے حقوق کی رعایت کرے جیسے اجتماعی قوانین اور نماز وروزہ وغیرہ جیسے انفرادی احکام کا پابند ہو۔ قرآن مجید میں حقیقی مسلمان کو مومن کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

تفصیلی جوابات

قرآن مجید کی لغت میں مسلمانوں کے معنی واضح ہونے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسلام کے معنی کی تحقیق کی جائے۔

لفظ اسلام س ل م کے باب افعال کا مصدر ہے اور اس کے معنی صحیح، عافیت اور ہر قسم کے عیب ونقص اور برائی سے پاک ہونا ہے اور باب افعال میں اس کے حسب ذیل معانی ہیں:

کسی قسم کے اعتراض کے بغیر امر و نہی کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا۔[1]

قرآن مجید نے بھی اسی وسیع معنی میں اسلام کو استعمال کیا ہے، جہاں پر فرماتا ہے: جو بھی زمین وآسمان میں ہیں یا وہ تمام مخلوقات جو زمین وآسمان میں ہیں، وہ مسلمان ہیں اور خدا کے فرمان کے سامنے تکویناً یا تشریعاً [2] (اختیاری یا اجباری) تسلیم ہیں۔

لیکن اسلام انسان کا خدا کے لئے رام ہونے کا وصف ہے اور خدا کی طرف سے ہر دستور کو چون و چرا کے بغیر قبول کرنا ہے خواہ وہ تکوینی ہو جیسے قضا وقدر یا تشریعی، جیسے اوامر و نواہی وغیرہ۔[3]

اس بنا پر، اسلام، ایمان واحسان جیسے اوصاف کے ضمن میں ایک مستقل مفہوم کا حامل ایک خاص وصف ہے۔

اصطلاح کے طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کو اسلام کہا جاتا ہے۔[4]

اسلام کے اصطلاحی معنی اور لغوی معنی کے درمیان رابطہ یہ ہے کہ دین اسلام خدا کے احکام اور دستورات کے مقابل بے چون و چرا اطاعت، فرمانبرداری اور تسلیم محض ہے۔[5]

قرآن مجید کی لغت میں، لفظ مسلمان صرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلہ میں استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ اسلام وسیع معنی (لغوی معنی) میں خدا کے فرمان کے سامنے تسلیم محض اور ہر قسم کے شرک دوگانگی پرستی سے مکمل اور خالص توحید ہے اور اسی وجہ سے قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کو مسلمان کے عنوان سے پہنچوایا گیا ہے۔[6]

اور اگر خداوند متعال پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد فرماتا ہے: آپ کہئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے میں سب سے پہلا اطاعت گزار ہوں[7]

تو یہاں پر سب سے پہلا مسلمان (اطاعت گزار) اپنی امت میں خدا کے حضور تسلیم محض کے معنی میں ہے (یعنی اصطلاحی معنی میں ہے) ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے انبیاء اور ان کے پیرو بھی مسلمان تھے اور خدا کے حکم کے سامنے تسلیم ہوتے تھے۔

بہر حال، جو کچھ سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۸۵ (اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا) اور اسی طرح سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۳ (آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا ہے اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسندیدہ بنا دیا ہے) میں استفادہ ہوا ہے وہاں پر مسلمان دین اسلام کے پیرو پر اطلاق ہوا ہے، کیونکہ انہوں نے دین اسلام کو قبول کر کے اور تمام انبیاء علیہم السلام

اور ادیان آسمانی پر ایمان لا کر خدا کے حضور تسلیم ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اس معنی کے مطابق اس وقت دوسرے ادیان کے پیروں کو مسلمان نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ انہوں نے آخری دین الٰہی کو قبول نہ کر کے خدا کے حضور تسلیم ہونے میں نافرمانی کی ہے اور مسلمانی اور تسلیم ہونے کی صفت سے محروم ہو چکے ہیں۔ لہٰذا خاص معنی میں مسلمان ان کو کہا جاتا ہے، جو خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتے ہوں گے، اگر چہ بہت سے دینی احکام اور دستورات کے پابند نہ ہوں۔ یہ معنی سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ جہاں پر اعراب میں سے کچھ لوگ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آگئے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر منت رکھیں، اور انہوں نے کہا: ہم نے ایمان لایا ہے اور مومن ہو چکے ہیں۔ خداوند متعال کی طرف سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی کہ انہیں کہہ دو کہ تم لوگوں نے ایمان نہیں لایا ہے۔ بلکہ انہیں کہنا چاہیئے کہ ہم نے اسلام لایا ہے اور مسلمان وہ ہے جو دینی احکام کے سامنے زبان، عقیدہ اور عملاً تسلیم ہو جائے، یعنی خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اسلام صلی اللہ کی رسالت کا زبانی بھی اقرار کرے اور عمل میں بھی خدا کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرے۔

حقیقی مسلمان وہ ہے جو دینی احکام، من جملہ اجتماعی قوانین، جیسے حق الناس، شہری حقوق وغیرہ اور انفرادی احکام جیسے: نماز، روزہ وغیرہ کا پابند ہو۔

حواشی

[1]۔ النکت والعیون، (تفسیر ماوردی)، ج۱ص ۳۷۹۔ ۳۸۰۔

[2]۔ تفسیر نمونہ، ج۲، ص ۶۴۳۔

[3]۔ طباطبائی، محمد حسین، المیزان (ترجمہ)، ج۱، ص ۴۵۴۔

[4]۔ الوجوہ والنظائر، ج۱، ص ۲۴۸۔

[5]۔ مبادی الاسلام، ص ۷۔

[6]۔ سورہ آل عمران، ۶۷۔

[7]۔ سورہ انعام ۱۴۔

کیا یہ کہا جا سکتا ہے، چونکہ آیہ تطہیر آیت کے وسط میں قرار پائی ہے، اس لئے حصر پر دلالت نہیں کرتی ہے؟! اہل بیت کون ہیں؟

مختصر جواب

سوال کے پہلے حصہ کے جواب میں کہا جا سکتا ہے: یہ جو آیہ تطہیر ایک آیت کے بیچ میں قرار پائی ہے، بالاخر جس چیز کا اقتضا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے قبل و بعد والے مطالب کے ساتھ ہم سیاق ہے اور اگر پیغمبر (ص) کی بیویوں سے کوئی اختصاص بھی نہ رکھتی ہو کم از کم عام طور پر ان پر بھی مشتمل ہے. لیکن توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اولا: اس قسم کے مطلب کو قبول کرنے کے فرض پر، ایک سیاقی اظہار سے زیادہ نہیں ہے اور اظہار سیاقی محکم ادلہ کے سامنے کارآمد نہیں ہے، اس لئے ہم ناچار ہیں کہ اس سلسلہ میں دوسرے بہت سے قرائن پائے جانے کی وجہ سے اس قرینہ سے اجتناب کریں. ثانیا: آیت کا سیاق اس قسم کا اقتضا نہیں کرتا ہے کہ آیہ تطہیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں پر مشتمل ہو.

پہلا نکتہ: تقریر و تحریر میں مہربانی اور جملہ معترضہ کا استعمال کرنا، اگر چہ اس بیان و تحریر کے سیاق واحد اور شباہت کو ضرر پہنچاتا ہے، لیکن اگر قرینہ کے ساتھ ہو تو، نہ صرف

فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے بلکہ کلام کی زیبائی کا سبب بن جاتا ہے .اس لئے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ آیہ تطہیر میں، چونکہ یہ آیت چند آیات کے بیچ میں واقع ہے،اس لئے کہا جائے کہ پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے خطاب ہوا ہے اور یہ پیغمبر (ص) کی بیویوں پر بھی شامل ہے، کیونکہ ممکن ہے مہربانی یا جملہ معترضہ کے خاص طور پر خاص افراد اصحاب کساء کی طرف اشارہ ہو اور ان پر منحصر ہو اور بہت سے قرائن اس دعویٰ کی تائید کرتے ہیں مثلاً:

۱.بعض روایات کے مطابق،آیہ تطہیر براہ راست نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس توہم کو دور کرنے کے لئے اس آیت کو یہاں پر قرار دینے کا حکم دیا ہے، کہ اہل بیتؑ کا حساب پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے جدا ہے، تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اہل بیت بھی ممکن ہے پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے مانند دنیا کی حقیر زندگی کو پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ترجیح دیں اور...

۲.اس آیت میں خداوند متعال کے کلام کا لہجہ بدل جاتا ہے اور بہت سے ضمایر جمع مؤنث کے استعمال، یعنی پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے خطاب کے بعد ضمیر جمع مذکر سے استفادہ کیا جاتا ہے.

۳.اہل لغت کے مطابق،عربی زبان میں اہل بیوی پر اطلاق نہیں ہوتا ہے،مگر مجاز کے طور پر، اسی لئے ام سلمہ نے آیت کے نزول کے بعد پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ اسے بھی اہل بیت میں شمار کریں.اس دعویٰ کا شاہد یہ ہے کہ زید بن ارقم کہتے ہیں:اہل بیت کا عنوان عورتوں پر صادق نہیں آتا ہے.

٤.پیغمبر (ص) کی بیویوں میں سے کسی ایک نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ آیہ تطہیر ان پر نازل ہوئی ہے، جبکہ حضرت عایشہ کو جنگ جمل میں اپنی تائید میں اس قسم کے ادلہ کی ضرورت تھی.

۵. سورہ احزاب کی آیت نمبر ۲۹ میں لفظ تر دناس بات کی حکایت کرتا ہے کہ خداوند متعال، پیغمبر اکرم (ص) کی بیویوں کے بارے میں کوئی غیر معمولی ارادہ نہیں رکھتا ہے، لیکن اہل بیت کے بارے میں ایک تکوینی اور نا قابل انکار ارادہ رکھتا ہے کہ انہیں ناپاکی اور آلودگی سے دور رکھے.

٦. لفظ اہل البیتمیں الف ولامعہد خارجی کے لئے ہے اور معروف ومشہور واقعہ اصحاب کساء کی طرف اشارہ ہے لہٰذا لفظ اہل البیت، آل عباء، اصحاب کساء اور یوم الدار کے مانند اشارے کا عنوان ہے.

لیکن دوسرا نکتہ: ان آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مخاطب قرار پائے ہیں کہ اپنی بیویوں سے یوں کہے: یا ایہا النبی قل لا زواجک...

اس کو جاری رکھتے ہوئے خداوند متعال نے خطاب کو بیت رسالت اور مقام نبوت سے متوجہ کیا ہے. تا کہ اس نکتہ کو سمجھایے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو اتنے امر ونہی کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرف سے بھی اہل بیت میں پلیدی داخل نہ ہو جایے، کیونکہ خداوند متعال نے ارادہ کیا ہے کہ اہل بیت سے پلیدی کو دور کرے، پس سیاق بھی آیہ تطہیر کے اصحاب کساء میں حصر ہونے کے منافی نہیں ہے.

لیکن سوال کے دوسرے حصہ کا جواب: مذکورہ بیان کے بعد شاید اب پھر سے جواب دینے کی ضرورت نہ ہو صرف اس نکتہ پر تاکید کرنا کافی ہے کہ متعدد روایتوں میں بیان ہوا ہے کہ اہل بیت سے مراد پیغمبر (ص)، امام علیؑ، حضرت فاطمہؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ ہیں اور دوسرے ایمہ بھی آیہ تطہیر کے حکم اور تاویل کے لحاظ سے ان میں شامل ہوتے ہیں.

تفصیلی جوابات

جس چیز سے سوال میں استناد کیا گیا ہے، وہ وہی چیز ہے جو بعض لوگوں کے کلام

میں آئی ہے کہ چونکہ آیہ تطہیر، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے متعلق آیات کے ضمن میں قرار پائی ہے، اگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے مخصوص نہ ہو، تو کم از کم انہیں بھی عام طور پر احاطہ کرتی ہے، لیکن یہ بے دلیل دعویٰ ہے اس کے علاوہ اس کے بر خلاف کافی دلیلیں پائی جاتی ہیں.

مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کرنے سے ہمیں حقیقت تک پہنچنے میں مدد ملے گی:

۱. اگر چہ ہمارا اعتقاد ہے کہ قرآن مجید کا نظم و ترتیب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے انجام پایا ہے، لیکن اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ بعض روایات کے مطابق آیہ تطہیر مستقل طور پر نازل ہوئی ہے حتی کہ ایک بھی روایت میں نہیں آیا ہے کہ یہ آیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے متعلق آیات کے ضمن میں نازل ہوئی ہے. اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس آیت کو یہاں سے اٹھا لیا جائے تو باقی آیات کے ڈھانچے میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا ہے.[1]

اس آیت کو یہاں پر رکھنے سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کے تمام افراد کی طرف اشارہ کرے اور انہیں دو حصوں میں تقسیم کرے، ایک حصہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں اور دوسرا حصہ پیغمبر (ص) کے اہل بیت، اور یہ سمجھایے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اقارب اور رشتہ دار ایک ہی تار و پود سے نہیں ہیں، بلکہ ان کے درمیان چند خاص افراد ہیں جن کے لئے خدا کی خاص عنایت شامل حال ہے اور نا پاکیوں سے پاک کیے گئے ہیں،

دوسرے الفاظ میں، اگر ہم یہ بھی قبول کریں کہ آیہ تطہیر کے ماقبل و مابعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے خطاب ہوا ہے تو ہم مزید دو طریقوں سے ثابت کر سکتے ہیں کہ اہل بیت سے مراد صرف اصحاب کساء ہیں، یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ.

الف، توجہ: توجہ، بیان کا ایک طریقہ ہے جو تقریر و تحریر کی زیبائی کا سبب بن جاتا

ہے،جیسا کہ سورہ حمد میں آیا ہے کہ وہاں پر غایب (الحمداللہ)خطاب سے حاضر (ایاک نعبد)میں تبدیل ہوا ہے اور آیہ تطہیر میں بھی توجہ اس نکتہ کو سمجھانے کے لئے ہے کہ اہل بیت سے پلیدی کو دور کرنا، حد درجہ اہمیت رکھتا ہے یہاں تک کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو بھی اس طرح امر و نہی ہوا ہے کہ ان کی طرف سے بھی اہل بیت تک کوئی عیب و اعتراض نہ پہنچے.[2]

ب،اعتراض: کلام میں جملہ معترضہ کو لانا اہل فصاحت و بلاغت کے لئے رسم و رواج میں ہے اور وہ ایسا کام اس لئے انجام دیتے ہیں کہ مطلب بہتر صورت میں ذہن نشین ہو جائے اور یہ طریقہ قرآن مجید میں کئی بار دہرایا گیا ہے.[3] زیر نظر آیت میں،اس لئے یہ جملہ معترضہ آیا ہے،کہ کوئی تصور نہ کرے کہ اہل بیت عصمت و طہارت پیغمبر(ص) کی بیویوں کے برابر ہیں،یعنی جہاں پر پیغمبر(ص) کی بیویوں کے لئے گناہ اور ناپسند کام کے ممکن ہونے کی بات کی جاتی ہے،وہاں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ احتمال اہل بیت اطہار کے حق میں بھی دیا جایے،جبکہ وہ ان چیزوں سے پاک ہیں .اس لئے جملہ معترضہ میں ذکر کر دیا گیا ہے کہ:اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ...[4]

۲.ان آیات میں جمع مونث کے ۲۰ ضمائر استعمال ہونے کے بعد خداوند متعال کا لہجہ بدل گیا ہے اور ان ضمائر کی جگہ پر ضمیر جمع مذکر لائی گئی ہے اور یہ سب سے بڑا قرینہ ہے کہ دعویٰ شدہ اظہار سیاق سے اجتناب کیا جانا چاہیے اور آیہ تطہیر کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے خطاب نہیں جاننا چاہیے.

۳.اہل لغت قائل ہیں کہ لفظ اہلکا بیوی پر اطلاق نہیں ہوتا ہے،مگر مجاز[5] کی صورت میں ہوسکتا ہے اور سورہ ہود کی آیت نمبر ۷۳ میں اگر چہ اہل بیت کا بیوی پر اطلاق ہوا ہے،لیکن استعمال حقیقت سے اعم ہے اور قرینہ کے موجود ہونے کے فرض پر،معنی مجازی کا ارادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور مذکورہ آیت میں اس قسم کے استعمال کے لئے قرینہ

موجود ہے، لیکن آیہ تطہیر میں نہ صرف اس مجاز کے لئے کوئی قرینہ موجود نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس قرینہ موجود ہے، اسی لئے ام سلمہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آیہ تطہیر کے نازل ہونے کے بعد سوال کرتی ہیں کہ کیا وہ بھی اہل بیت میں سے ہیں؟ یا پیغمبر (ص) سے درخواست کرتی ہیں کہ اسے اہل بیت میں شامل کریں [6] جبکہ اگر لفظ اہل پیغمبر (ص) کی بیویوں پر بھی مشتمل ہوتا تو ام سلمہ کا سوال یا درخواست کرنا بے جا تھا.

اسی لئے زید بن ارقم کہتے ہیں: اہل بیت کا عنوان بیویوں پر صادق نہیں آتا ہے.[7]

٤. اہل سنت سے نقل کی گئی روایتوں کے مطابق، عائشہ وام سلمہ واضح الفاظ میں اعلان کرتی تھیں کہ آیہ تطہیر ان کی شان میں نازل نہیں ہوئی ہے.[8] اور علامہ امینی کے فرمانے کے مطابق اگر یہ آیت پیغمبر (ص) کی بیویوں پر بھی مشتمل ہوتی تو عائشہ ضرور اسے جنگ جمل میں اپنی اونٹنی کے ماتھے پر لکھتیں لیکن انہوں نے یہ کام نہیں کیا باوجودیکہ اس قسم کے دلائل کی محتاج تھیں.[9]

اس کے باوجود، دو طایفوں نے دعویٰ کیا ہے آیہ تطہیر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں پر نازل ہوئی ہے. پہلا طایفہ بعض راویوں جیسے: عکرمہ، مقاتل بن سلیمان اور عروہ بن زبیر پر مشتمل ہے کہ کلی طور پر انہوں نے اپنا ذاتی نظریہ پیش کیا ہے اور جہاں پر انہوں نے اس روایت کو ابن عباس سے نقل کیا ہے، جھوٹ بولنے کے متہم ہوئے ہیں.[10]

دوسرا طائفہ بعض اہل سنت مفسرین ہیں جنہوں نے سیاق واحد کے استناد پر، اس قسم کے مطلب کا دعویٰ کیا ہے لیکن وحدت سیاق کو، قبول کرنے کے فرض پر بھی، مذکورہ محکم دلیلوں کے سامنے اس کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

٥. سورہ احزاب کی آیت نمبر ٢٩ میں لفظ قرد ناس نکتہ کی حکایت کرتا ہے کہ پروردگار

عالم کی ذات نے، پیغمبر (ص) کی بیویوں کے بارے میں غیر معمولی مشیت کا مظاہرہ نہیں کیا ہے، یعنی انہیں مختار فرما کر ذکر کیا ہے کہ اگر پیغمبر اکرم (ص) کی بیویاں ہونے کا فخر حاصل کر نا چاہتی ہیں تو انہیں صالحین کے نقش قدم پر چلنا ہوگا.

لیکن آیہ تطہیر میں إِنَّمَا يُرِيدُ اللهُ کا حصہ ایک ایسے خاندان کی حکایت کرتا ہے جو ہر قسم کی پلیدی سے پاک ہے اور حق تعالیٰ کی مشیت اور تکوینی [11] ارادہ سے پیدا ہوا ہے.

وضاحت یہ کہ آیہ تطہیر میں ایک طرف انما آیا ہے جو پلیدی کو دور کرنے کے اور تطہیر کے حصر کی حکایت کرتا ہے اور دوسری طرف اہل بیت پر عنکم مقدم قرار پایا ہے اور لفظ اہل بھی حصر و اختصاص کے طور پر آیا ہے اور یہ دونوں رجس کے دور ہونے اور ان اہل بیت کے پاک ہونے کے حصر ہیں جو عنکم میں مخاطب قرار پائے ہیں اور اسی کی دلالت کرتے ہیں، یعنی خداوند متعال نے ارادہ کیا ہے کہ صرف آپ اہل بیت سے پلیدی کو دور کرے.

اس لئے، اہل بیت ایک اہم خصوصیت کے حامل ہیں اور یرید خدا کی طرف سے ارادہ کی دلیل ہے جو اس خاندان سے پلیدی کو دور کرنے سے متعلق ہے اور یہ عنایت و توفیق ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی ہے، بلکہ وہ لوگ ان خاص عنایتوں سے بہرہ مند ہوتے ہیں، جو اپنے اختیار اور ارادہ سے اس کے لئے مناسب ماحول فراہم کرتے ہیں.

یہ ارادہ نا قابل تغیر ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے متعلق نہیں ہوسکتا ہے چونکہ آیہ تطہیر سے قبل والی آیات میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ ممکن ہے تم عورتیں دنیا کی پست زندگی کی طرف میلان پیدا کروگی تو اس صورت میں پیغمبر (ص) کی بیویاں ہونے کے فخر سے محروم ہو جاؤ گے.[12]

٦. لفظ اہل بیت میں، الف ولامعہد کے لئے ہے اور رونما ہونے والے واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے. یعنی لفظ اہل البیت مانند یوم الدار کے جو ایک مشخص عنوان ہے، اس

دن کے لئے جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ لوگوں کو حضرت ابو طالب کے گھر میں جمع کر کے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تھا، یہ عنوان ایک اشارہ ہے[13] اور ان لوگوں کی حکایت کرتا ہے جو ایک خاص گھر میں (روایات کے مطابق یہ گھر ام سلمہ کا گھر تھا) ایک خاص دن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عبا کے نیچے جمع تھے اور وہ افراد عبارت ہیں: پیغمبر (ص)، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ، [14] یعنی اہل بیت کے عنوان کا آل عبا اور اصحاب کساء کے عنوان سے کوئی فرق نہیں ہے.

منطقی لحاظ سے یہ ایک قضیہ خارجی ہے نہ کہ حقیقی اور خارجی قضایا بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں کہ ایک عنوان موضوع کا اشارہ قرار پاتا ہے، مثال کے طور پر اگر کہا جائے کہ ان دو عالموں کا احترام کرو، یعنی ان دو اشخاص کا جو خارج میں موجود ہیں، اور یہ بدیہی ہے کہ خارجی قضایا میں حکم غیر موضوع پر مشتمل نہیں ہوتا ہے. لیکن شواہد:

۱الف: بیتکی ماقبل اور مابعد آیات میں جمع کی صورت میں عورتوں پر اضافہ ہوا ہے کہ عورتوں کے کمرے کے معنی میں ہے. پس البیت بھی ایک مخصوص کمرہ ہونا چاہیے.

ب: روایات کے مطابق آیت شخص پیغمبر (ص) پر بھی مشتمل ہے کیا اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شامل ہونے کے لئے اس تفسیر کے علاوہ کوئی اور راہ ہے؟

ج: سورہ ہود کی آیت نمبر ۷۳ میں لفظ اہل بیت، الف و لام سے آیا ہے اور وہاں پر مراد اہل خانہ یعنی حضرت ابراہیمؑ اور سارہ ہیں اور یقیناً وہاں پر مراد، اہل قبلہ، ابراہیمؑ کی بیویاں یا ابراہیمؑ کے رشتہ دار نہیں ہیں اور یہ ہمیں آیہ تطہیر میں لفظ اہل البیت کے معنی کو سمجھنے میں مدد کر سکتا ہے.[15]

۷. ان آیات اور آیہ تطہیر میں غور کرنے سے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آیت کا سیاق نہ صرف آیہ تطہیر کے پیغمبر (ص) کی بیویوں پر مشتمل ہونے کی دلیل نہیں ہے (خواہ

خصوصی طور پر کہ صرف پیغمبر(ص) کی بیویاں شامل ہوں یا عمومی طور پر کہ پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں اور دوسرے لوگ شامل ہوں) بلکہ اس نظریہ کے موافق ہے کہ آیت اصحاب کساء کی شان میں نازل ہوئی ہے.

ان آیات میں،پیغمبر(ص)کے لئے خطاب ہو تا ہے:يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ...

یعنی خدا وند متعال نے پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اپنی بیویوں کو خدا ورسول(ص)اور دنیا کی زندگی میں مختار بنادے.اس کے علاوہ فرمایا: يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ط ...اور یہ خطاب عورتوں کے لئے اور خدا کے حکم کے استمرار میں پیغمبر(ص)کے لئے ہے تا کہ اپنی بیویوں تک اس حکم کو پہنچادیں یا تذکرہ اور توجہ کے طور پر ہے کہ خدا وند متعال براہ راست پیغمبر(ص) کی بیویوں سے خطاب کرتا ہے.

اس آیت میں تَذَكُّر اورتوجہ کا فلسفہ یہ ہے کہ پیغمبر(ص) کی بیویاں پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب ہیں اور مقام نبوت اور بیت رسالت کا احترام برقرار رکھنے کے لئے خدا نے ان سے خطاب کیا ہےاورفرمایا ہے:اگرتم میں سے کسی نے کھلم کھلا برے کام کا ارتکاب کیا تو اس پر دوگنا عذاب کیا جائے گا اور اس کو جاری رکھتے ہوئے خداوند متعال نبوت کے مقام اور رسالت کے گھر سے مخاطب ہوا ہے تا کہ اس نکتہ کو سمجھائے کہ پیغمبر(ص) کی بیویوں کا ذکر کرنے اور ان اوامر ونواہی کے صادر کرنے کا سبب اس گھر سے ہر قسم کی پلیدی کو دور کرنا اور اسے پاک و پاکیزہ بنانا ہے.

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ ...یعنی خدا وند متعال نے پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں سے تشریعی ارادہ کے ذریعہ چاہا تا کہ یہ کام انجام دیں،یہ اس لئے

ہے کہ آپ اہل بیت اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقام اور بیت نبوت سے پلیدی کو دور کرے اور اس سلسلہ میں ہمارا استدلال یہ ہے کہ آیت نے فرمایا: لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اور یہ نہ فرمایا: الاذهاب الرجس اور لام تعلیل کے لئے ہے، پس خداوند متعال نے ارادہ کیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں پر کچھ تکالیف عائد کرے. اس ارادہ کی وجہ اہل بیت سے پلیدی کو دور کرنا ہے، تاکہ اس جہت سے بھی، اہل بیت رسول اکرم (ص) کو کسی قسم کی پلیدی اور ضرر نہ پہنچ پائے.

یہ امر، اہل بیت سے پلیدی کو دور کرنے کے تکوینی ارادہ کی حکایت کرتا ہے اور یہ اصل و بنیاد ہے اور یہ اصل اس قدر اہمیت کی حامل ہے کہ حقیقت میں خداوند متعال ہرگز نہیں چاہتا ہے کہ اس گھر سے منسوب افراد کے ذریعہ بھی اہل بیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچے. اس لئے تشریعی امر و نہی کے ذریعہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کے لئے برائی کے مرتکب ہونے کی صورت میں دوگنی سزا مقرر کی ہے.[16] نتیجہ یہ کہ:

۱. آیہ تطہیر کا اصحاب کساء پر منحصر ہونا سیاق سے منافی نہیں ہے اور اگر توجہ اور جملہ معترضہ کے لحاظ سے کسی سیاق سے منافات ہو، تو اس میں موجود قرائن کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ آیت منحصر بہ اصحاب کساء ہے.

۲. اہل بیت سے مراد، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہیں، یا اس لحاظ سے کہ یہ لفظ قرآن مجید میں ایک خاص لفظ ہے[17] یا یہ کہ اہل بیت اشارہ شدہ عنوان ہے.[18]

آخر پر اس سوال پر بحث کی جانی چاہیے کہ اگر ایسا ہے تو ائمہ اطہارؑ نے لفظ اہل بیت کو اپنے سے کیا مطابق جانا ہے؟[19]

اس سوال کے جواب میں کہنا چاہئے کہ: اس تفسیر کے پیش نظر کہ آیت میں نبوت

کے گھر،اور مقام رسالت سے مخاطب کیا گیا ہے اور اس گھر کی وسعت اور تنگی کے حدود قرائن اور روایات کے ذریعہ مشخص ہوتے ہیں اور اس میں موجود قرائن اس نکتہ کی حکایت کرتے ہیں کہ آیہ تطہیر نے مسلمانوں کی رہبری اور سربراہی کو اہل بیت کے ذمہ رکھنا چاہا ہے.

لیکن شواہد:

الف:حضرت علیؑ،مہاجر و انصار کے اجتماع میں،مسلمانوں کی قیادت کے سلسلہ میں اپنی اولیت کے لئے اہل بیت سے ہونے سے استدلال کرتے ہیں.[20]

ب:حضرت علیؑ،حضرت عمر کی چھ افراد پر مشتمل شوریٰ میں،اپنی قابلیت کے ثبوت میں آیہ تطہیر سے استدلال کرتے ہیں.[21]

ج:امام حسنؑ نے بھی، خلافت پر پہنچنے کے موقع پر،امت اسلامیہ کی رہبری کے لئے اپنی لیاقت کے ثبوت میں آیہ تطہیر سے استناد کیا ہے.[22]

د:امام حسینؑ نے بھی اس سلسلہ میں اپنی صلاحیت کے ثبوت میں آیہ تطہیر سے استناد کیا ہے.[23]

ہ.پیغمبراسلامؐ، چھ مہینے یا اس سے زیادہ مدت تک، ہر روز صبح مسجد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نماز کے لئے جاتے ہوئے،حضرت فاطمہ زہراؑ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہو کر فرماتے تھے:اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ.[24]

کیا اس عمل سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کے علاوہ کوئی اور مقصد تھا کہ لوگوں میں اعلان کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور کے گھر کی طرف رجوع نہ کریں.؟!

اس لئے یہ عنوان اہل بیت اطہار سے متعلق ہے، کیونکہ وہ امت اسلامیہ کے حقیقی رہبر اور قائد ہیں.

یہ مطلب، حتی کہ الف ولام کو عہد خارجی اور اہل بیت کے عنوان کو عنوان اشارہ

تفسیر کرنے کے مطابق بھی صادق آتا ہے، کیونکہ اس نظریہ کے مطابق لفظ اہل بیت دو لحاظ سے ملحوظ نظر قرار پاتا ہے:

۱. یہ لفظ نزول کی مناسبت سے ملحوظ نظر قرار پایا ہے.

۲. یہ عنوان اس سے متعلق حکم کی مناسبت، یعنی پلیدی کو دور کرنے اور طہارت کے ثبوت سے ملحوظ نظر قرار پایا ہے.

پہلے لحاظ کے مطابق صرف اہل بیت آل کساء ہیں، یعنی وہی پنجتن پاک جو ایک خاص دن میں عبا کے نیچے قرار پائے.

لیکن دوسرے لحاظ سے چونکہ دوسرے ایمہ اطہارؑ آیہ تطہیر کے مفہوم میں پنجتن آل عبا کے شریک و یکساں ہیں، لہٰذا یہ عنوان ان پر بھی صادق آتا ہے اور شاید اسی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: سلمان، ہم اہل بیت میں سے ہے.[25]

امام صادقؑ نے ابن کثیر کے جواب میں فرمایا: اہل بیت وہی پنجتن ہیں، لیکن دوسرے ایمہ قرآن مجید کی ایک دوسری آیت، یعنی: وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ کے استناد سے اس خاص عنایت میں شامل ہیں.[26] یعنی آیت کی تفسیر نے، دوسرے ائمہ کو بھی پلیدی کے دور ہونے کی عنایت میں شامل قرار دیا ہے. آیہ تطہیر کی تفسیر آیہ اولواالارحام سے جو ثابت کرتی ہے کہ آیہ تطہیر ایمہ اطہارؑ پر بھی مشتمل ہے.[27] لیکن لفظ کے ذریعہ نہیں بلکہ شرح و تفسیر کے ذریعہ.

حواشی

[1] طباطبایی، المیزان، ج۱۶، ص۳۱۱. ۳۱۲.

[2] کرکی، نفحات اللاهوت، ص۸۵: مظفر، محمد حسین، دلائل الصدق، سید جعفر مرتضی عاملی، اہل بیت در آیہ تطہیر، ص۵۸. ۶۱.

[3] یوسف۔۲۸و۲۹،نمل۔۳٤و۳٥:بقرہ۔٧٥.٧٣،واقعہ۔٧٦،لقمان۔١٦و١٣.

[4] ملاحظہ ہو:اہل بیت در آیہ تطہیر،ص٦٢.٦٠،اشراقی،شہاب الدین وفاضل لنکرانی،اہل بیت،ص٥٣.٨١.

[5] اہل لغت نے اہل رجلاور اہل بیتمیں فرق کیا ہے اورعورتوں پر اہل بیت کے استعمال کومجاز اور مسامحہ گوئی جانتے ہیں .ملاحظہ ہو:تاج العروس،ج١،ص٢١٧،لسان العرب،ج١ ص٣٨،مفردات راغب،ص٢٩.لہذا پیغمبرصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض روایات کے مفہوم کے مطابق اگر چہ ام سلمہ کو اپنے اہل اور بیویوں میں سے جانتے ہیں لیکن آپ(ص)نے یہ قبول نہیں فر مایا ہے کہ وہ اہل بیت سے ہیں .ملاحظہ ہو:سیوطی،الدر المنثور،ج٥،ص١٩٨،مشکل الآثارطحاوی،ج١،ص٣٣٤،محمد بن جریر،طبری جامع البیان، ج٢٢، ص٧،نفحات الاہوت،ص٨٤،مصطفی بن اسماعیل دمشقی،مرقہ الوصول،ص١٠٦،بحار الانوار،ج٣٥،ص٢١٧و٢٢٨.ملاحظہ ہو:تفسیر ابن کثیر،ج٣،ص٤٨٥و٤٨٤،،بحرانی سید ہاشم،غایہ المرام.

[6]

[7] ابن تیمیہ،منہاج السنہ،ج٤،ص٢١،صحیح مسلم،ج٧،ص١٢٣،بحار الانوار،ج٣٥،ص٢٣٠وج٢٣،ص١١٧،ابن حجر عسقلانی،الصواعق المحرقہ،ص١٤٧،بحرانی،سید ہاشم،البرہان فی تفسیر القرآن،ج٣،ص٣٢٤،،بیاضی عاملی،الصراط المستقیم، ج١،ص١٨٥،شوستری،قاضی نوراللہ،احقاق الحق وابطال الباطل،ملحقات آیت اللہ مرعشی نجفی،ج٩،ص٣٢٣،اہل بیت در آیہ تطہیر،ص١١٩.

[8] بدران،عبدالقادر،تہذیب تاریخ دمشق،ج٤،ص٩٠٨،مجمع البیان،ج٨،ص٣٥٦،قندوزی،ینابیع المودہ،ص٢٤٩،ابن حجر عسقلانی،الصواعق المحرقہ،ص١٤١و...اہل بیت در آیہ تطہیر،ص٢٠.٢٨،،طباطبایی،المیز ان،ج١٦،ص٣٢٤.٣١٦.

[9] بہ نقل از کتاب اہل بیت آیہ تطہیر،ص٧٨.

[10] ملاحظہ ہو:اہل بیت در آیہ تطہیر،ص٢٢،اشراقی و فاضل لنکرانی،اہل بیت،ص٥٣.٥،موسوی،علامہ شرف الدین، الکلمہ الغراء فی تفصیل الزہراء،قا موس الرجال،شرح حال عروہ،دلائل

الصدق، ج۲،ص۹۵،شوستری، قاضی نوراللہ، احقاق الحق و ابطال الباطل، ج۲،ص۵۰۲.

[11] تکوینی ارادہ وہ ارادہ ہے جو مرید کے فعل یعنی تکوینی اور اس کے ایجاد سے متعلق ہے اور یہ ارادہ خدا کے لئے بھی ہے اور انسان کے لئے بھی،لیکن انسان کا تکوینی ارادہ ہمیشہ انجام پانے والا نہیں ہے بلکہ ارادہ ازل کے تابع ہے .لیکن ارادہ تشریعی ایک ایسا ارادہ ہے جو دوسرے فعل سے متعلق ہے اس لحاظ سے کہ وہ اسے اپنے اختیار سے انجام دے.اور یہ وہی خدا کا امر و نہی ہے کہ مکلف کی طرف سے اسے انجام دینا یا انجام نہ دینا ممکن ہے .

[12] ملاحظہ ہو:اشراقی و فاضل لنکرانی، اہل بیت،ص۸۱.۹۲.

[13] یعنی وہ عنوان جس میں خارج کی طرف اشارہ ہو اور موضوعیت رکھنے والی چیز خارج ہے نہ عنوان.

[14] عروسی حویزی، عبدعلی بن جمعہ،تفسیر نورالثقلین، ج٤،ص٢٧٦و٢٧٧.

[15] ملاحظہ ہو:اشراقی و فاضل لنکرانی، اہل بیت،ص۱۱۲.۱٤۲.

[16] ملاحظہ ہو:اہل بیت در آیہ تطہیر،ص۵۱.۳۸.

[17] ملاحظہ ہو:طباطبایی، المیز ان، ج١٦،ص۳۱۲.

[18] ملاحظہ ہو:اہل بیت،ص۱۱۲.

[19] تفسیر نورالثقلین، ج٤،ص٢٧٥،روایت احتجاج وص٢٧٣ روایت اصول کافی.

[20] ابن ابي الحدید،شرح نہج البلاغہ، ج٦،ص١١و١٢.

[21] بحرانی، سید ہاشم، غایہ المرام،ص٢٦٥،احتجاج طبرسی.

[22] قاموس الرجال، ج٦،ص٢٠.

[23] ابن طاوس، لہوق،ص٥٣.

[24] تفسیر ابن کثیر، ج٣،ص٤٨٣،مسند احمد، ج٣،ص٢٥٩،الکلمہ الغراء فی تفضیل الزہراء.

[25] قاموس الرجال، ج٤،ص٤٢٣.

[26] عروسی حویزی، عبدعلی بن جمعہ،تفسیر نورالثقلین روایت عبدالرحمن بن کثیر، ج٤،ص٢٧٣.

[27] اشراقی و فاضل لنکرانی، اہل بیت،ص۱٤۳.۱۱۲و۵۳.۵۰.

کیا کتاب الٰہی میں ہر رطب و یابس (تر وخشک) موجود ہے؟ کیا کتاب سے مراد یہی قرآن مجید ہے؟ رطب و یابس سے مراد کیا ہے؟ اور یہ کیسی موجودات ہیں؟

مختصر جواب

اگرچہ بعض دوسری آیات میں کتاب مبین ذکر ہوا ہے اور اس سے مراد یہی قرآن مجید ہے، لیکن اس آیت اور علم الٰہی کی سند کو بیان کرنے والی اس کی مشابہ آیات میں، کتاب مبین سے مراد مخلوقات کو خلق کرنے سے پہلے علم الٰہی کا مرحلہ ہے جو خود دوسری کتابوں اور الواح پر مشتمل ہے، لیکن اس کی کمیت و کیفیت ہمارے لئے نامعلوم ہے.

قرآن مجید میں رطب و یابس (تر وخشک) تمام چیزوں کے بارے میں کنایہ ہے اور خود کسی خاص مخلوق کی طرف اشارہ نہیں ہے اور اجمالی طور پر تفصیل کے بعد ذکر ہوئے ہیں، یعنی اس کے بعد کہ فرماتے ہیں: غیب کی کنجیاں صرف اس کے پاس ہیں (اور کوئی اس کے بارے میں مطلع نہیں ہے مگر یہ کہ خداوند متعال خود ان کو مطلع فرمائے) اور جو کچھ دریا اور خشکی میں ہے اس کے بارے میں وہ علم رکھتا ہے اور ایک پتا بھی نہیں ہلتا ہے مگر یہ کہ خداوند

متعال اس کے بارے میں علم رکھتا ہے...چھوٹی موٹی مثالیں بیان کرنے سے صرف نظر فرمایا ہے اور وہ کہتا ہے (خلاصہ) ہر تر وخشک کتاب مبین میں درج ہے اور ہم اس کا علم رکھتے ہیں
.

تفصیلی جوابات

جو کچھ قرآن مجید کی آیات، روایات اور محققین ،فلاسفہ، متکلمین اور مفسیرین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ علم الہیتین صورتوں میں قابل ملاحظ ہوتا ہے:[1]

الف: خداوند متعال کا علم، اس کی ذات وصفات کے بارے میں اور خداوند متعال کا علم اس کے ذاتی مقتضیات کے بارے میں یہ علم ناقابل تغیر ہے اور یہاں پر آیت کی مراد نہیں ہے.

ب: علم الہی مخلوقات کے بارے میں، خلق کے بعد: مخلوقات کو پیدا اور تخلیق کر نے کے بعد ان کے جزئیات کے بارے میں علم. یہ ملاحظہ ایک قابل تفکیک ملاحظہ ہے اور اضافہ طرفین کے ملاحظہ کا نیاز مند ہے، یعنی خداوند حوادث معلومہ کے بارے میں عالم ہے اور چونکہ طرفین ہے اس لئے یہ علم تبیعت میں تغیر پیدا کر کے مخلوقات کی تعداد کے مطابق متعدد ومتغیر ہوتا ہے اور ان کے زمانہ سے متعلق ہونے کی وجہ سے وہ بھی زمانہ کے مطابق ہو تا ہے.

اس علم سے، علم فعلی میں تبدیل ہوتا ہے اور صفات فعلیہ شمار ہوتا ہے، لیکن یہاں پر یہ ملاحظہ بھی مراد نہیں ہے.

ج: مخلوقات اور ان کے جزئیات کے بارے میں ازل سے اور پیدائش سے قبل علم، یعنی خداوند متعال، آسمان وزمین اور ان میں موجود مخلوقات وحوادث واتفاقات کو خلق کر نے سے پہلے ان کے تمام مراحل اور ان کی خلقت وموجودیت اور حوادث کی کیفیت کے

بارے میں علم رکھتا ہے.اور یہ علم تمام مخلوقات سے بالاتر ایک موجود میں منعکس اورجلوہ گر ہے کہ اسے کتاب مبین یا:ام الکتاب کہا جاتا ہے اورلوح محفوظ اورلوح محو واثبات پر مشتمل ہے .پس یہ علم دوحصوں پر مشتمل ہے .ایک حصہ غیب ہے اور دوسرا حصہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ مشاہدہ میں آتا ہے،ایک حصہ ثابت اور نا قابل تغیر ہے اور ایک حصہ مٹانے لکھنے کے قابل ہے.

پس اس قسم کی آیات میں کتاب مبین کی مراد،[2] علم الٰہی کا تمام مخلوقات پر محیط ہونا ہے،ان کی خلقت،فعالیت اورتحرکات سے پہلے،اورسورہ انعام کی آیت نمبر ٥٩ میں رطب ویابس (ہرتر وخشک) سے مراد تمام مخلوقات ہیں جوکسی طریقہ یا اعتبار سے ان دو واقعات میں سے کسی ایک کے تحت ہوتی ہیں.

رطب ویابس(تر وخشک)دونقیض ہیں،یعنی کوئی مخلوق ممکن نہیں ہے،مگر یہ کہ ان دو میں سے ایک کے تحت ہواورکوئی مصداق پایانہیں جاتا جوان دونوں کے تحت ہو یا ان دونوں میں سے کسی ایک کے تحت نہ ہو .لہٰذا ان دونوں کا آیت میں ایک ساتھ ذکرکیا جانا تمام عالم ہستی کی مخلوقات کے بارے میں کنایہ ہے .اس لحاظ سے ان دونوں کے لئے کوئی خاص مصداق معین نہیں ہوتا ہے .اگر چہ بعض روایات میں [3] اسقاط شدہ جنین کو یابس اور نوزائیدہ کورطب کے لئے مثال قرار دیا گیا ہے،لیکن یہ فقط مثال کے طور پر ہیں.

لیکن بعض[4] دوسری آیات میں کتاب مبین وہی قرآن مجید ہے،نہ کہ مخلوقات کے قبل از خلقت علم الٰہی کی خاص تجلی گاہ،اورآیات کے معنی ومراد کومشخص کرنے کے لئے آیت کے ماقبل ومابعدآیات کے سیاق پرتوجہ کرنے کی ضرورت ہے ..مثال کے طور پر پہلی قسم میں علم الٰہی کے وسیع ہونے کی طرف اشارہ ہے،لیکن دوسری قسم میں نازل ہونے اور وحی ....کے ہمراہ ہیں.

لیکن دونوں موارد میں کتاب مبین کے لغوی معنی یکساں ہیں،یعنی ایک آشکار اور واضح کتاب جس میں کسی قسم کی خطا اور ابہام کا وجود نہیں ہے.

حواشی

[1] ملاحظہ ہو: معارف قرآن، ج۱.۳،ص ۱۹٤.۱۸٦.

[2] سورہ انعام۔٦،سورہ سباء۔ ۳،سورہ نمل ۷٥،سورہ ہود۔٦،سورہ یونس۔٦١.

[3] ترجمہ المیزان،،ج۷،ص۲۱۲، کنز الدقایق،ج۷،ص ٤٤ ۳.۲ ٤ ۳.

[4] سورہ قصص۔۲،سورہ نمل۔۱،سورہ شعراء۔۲،سورہ حجر۔۱،سورہ یوسف۔۱،سورہ مائدہ۔۱٥.

قرآن کے اسماء کو بیان فرمایئے۔

مختصر جواب

قرآن مجید کے لئے بہت سے اسماء ذکر کئے گئے ہیں اور مسلمانوں کے درمیان ان میں سے صرف بعض ہی مشہور ہیں۔ البتہ بعض الفاظ قرآن میں قرآن کی صفت کے عنوان سے ذکر ہوئے ہیں لیکن ان کو قرآن کے نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور قرآن کے نام اور صفت کی تشخیص میں اسی اختلاف کی بنیاد پر علوم قرآن کے دانشوروں کے درمیان اسمائے قرآنی کی تعداد میں اختلاف ہے۔

بعض مفسرین مثلا صاحب مجمع البیان مرحوم طبرسی نے صرف ۴ نام ذکر کئے ہیں اور کچھ نے مثلا مرحوم ابوالفتوح رازی نے ۴۳ نام بیان کئے ہیں۔

ان میں سے بعض نام روایات میں بھی آئے ہیں۔

تفصیلی جوابات

مسلمانوں کی آسمانی کتاب قرآن مجید کے بہت سے نام اور صفتیں ہیں اور علوم قرآنی کے دانشوروں نے ان میں سے بعض کی تحقیق کی ہے اور بیان کیا ہے۔ زیادہ نام اور زیادہ صفات ہونے کے سبب کچھ لوگوں نے قرآن کی صفت اور نام میں دھوکہ کھایا ہے۔ لیکن چونکہ ہر صفت، نام کے طور پر بھی استعمال کی جاسکتی ہے اس لئے نام کے خانہ میں اسماء کے ذکر کرنے کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ بڑے مفسری جیسے ابوالفتوح رازی تمام اوصاف و

اسماء کو اسمائے قرآن کے ذیل میں لائے ہیں۔[1] انہوں نے ۴۳ نام قرآن کے لئے ذکر کئے ہیں جن میں سے بعض میں وصفی پہلو پایا جاتا ہے۔

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں صرف ۴ نام ذکر کرنے پر اکتفا کی ہے اور صرف ۱۔قرآن ۲۔فرقان ۳۔کتاب ۴۔ذکر کو قرآن کے نام کے عنوان سے ذکر کیا ہے۔

لیکن بدرالدین زرکشی نے نقل کیا ہے کہ حرالیؒ نے اس بارے میں کتاب لکھی ہے اور نوّے اسماء سے زیادہ قرآن کے نام ذکر کئے ہیں۔[2]

صاحب التمہید نے قاضی عُزَیزی سے قرآن کے ۵۵ اسماء نقل کئے ہیں جن میں ۴۳ نام ابو الفتوح رازی کے بیان کردہ اسماء سے مشترک ہیں۔[3] یہ ۵۵ نام (یا صفت) خود قرآن سے اخذ کئے گئے ہیں۔

یہاں ہم ان اسماء کے ساتھ ان آیات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جن میں یہ نام آئے ہیں:

۱۔قرآن (طہ۔۲؛ نساء۔ ۸۲)

۲۔فرقان (انفال۔۲۹؛ آل عمران۔ ۳و۴؛ فرقان۔۱)

۳۔کتاب (فاطر۔۲۹؛ نساء۔۱۰۵)

۴۔ذکر (آل عمران۔۵۸؛ حجر۔۹)

۵۔تنزیل۔(شعراء۔۱۹۲؛ انسان۔ ۲۳)

۶۔حدیث (زمر ۲۳۔کہف۔۶)

۷۔موعظہ (یونس۔۵۷)

۸۔تذکرہ (حاقہ۔۴۸)

۹۔ذکری (ہود۔۱۲۰)

۱۰۔ بیان (آل عمران۔ ۱۳۸)

۱۱۔ ہدیٰ (بقرہ۔ ۲)

۱۲۔ شفاء (فصلت۔ ۴۴)

۱۳۔ حکم (رعد۔ ۳۷)

۱۴۔ حکمت (احزاب۔ ۳۴)

۱۵۔ حکیم (آل عمران۔ ۵۸)

۱۶۔ مہیمن (مائدہ۔ ۴۸)

۱۷۔ ہادی (جن۔ ۱و۲)[4]

۱۸۔ نور (اعراف۔ ۱۵۷)

۱۹۔ رحمت (نمل۔ ۷۷)

۲۰۔ عصمت (آل عمران۔ ۱۰۳)[5]

۲۱۔ نعمت (ضحیٰ۔ ۱۱)

۲۲۔ حق (حاقہ۔ ۵۱)

۲۳۔ تبیان (نحل۔ ۸۹)

۲۴۔ بصائر (قصص۔ ۴۳)

۲۵۔ مبارک (انبیاء۔ ۵۰)

۲۶۔ مجید (ق۔ ۱)

۲۷۔ عزیز (فصلت۔ ۸۷)

۲۸۔ عظیم (حجر۔ ۸۷)

۲۹۔ کریم (واقعہ۔ ۷۷)

۳۰۔سراج (احزاب۔۴۶)[6]

۳۱۔منیر (احزاب۔۴۶)

۳۲۔بشیر (فصلت۔۳و۴)

۳۳۔نذیر (فصلت۔۴)

۳۴۔صراط (حمد۔۶)

۳۵۔حبل (آل عمران۔۱۰۶)

۳۶۔روح (شوریٰ۔۵۲)

۳۷۔قصص (یوسف۔۳)

۳۸۔فصل (طارق۔۱۳)

۳۹۔نجوم (واقعہ۔۷۵)[7]

۴۰۔عجب (جن۔۱)

۴۱۔قیّم (کہف ۱و۲)

۴۲۔مبین (یوسف۔۱)

۴۳۔علیّ (زخرف۔۴)

۴۴۔کلام (توبہ۔۶)

۴۵۔قول (قصص۔۵۱)

۴۶۔بلاغ (ابراہیمؑ۔۵۲)

۴۷۔متشابہ (زمر۔۲۳)

۴۸۔عربی (زمر۔۲۸)

۴۹۔بشریٰ (نمل۔۲)

۵۰۔عدل (انعام۔۱۱۵)

۵۱۔امر (طلاق۔۵)

۵۲۔ایمان (آل عمران۔۱۹۳)

۵۳۔نباء (نبا۔ا و ۲)

۵۴۔علم (انبیاء۔۴۵)

۵۵۔وحی (رعد۔۳۷)

البتہ ان اسماء میں سے بعض زیر اشکال ہیں یعنی جس تفسیر یا جس زاویہ سے اس لفظ کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے اس بنیاد پر صحیح ہے اور ممکن ہے کہ قطعی تفسیر کی بنیاد پر اس لفظ کی تفسیر، قرآن نہ ہو۔ اسی لئے بعض نے قرآن کے اسماء کو کم شمار کیا ہے۔ مثلا صراط مستقیم سے مراد قرآن ہو تو اسے قرآن کا نام کہنا صحیح ہے ورنہ نہیں۔

یہ وہ اسماء تھے جنہیں قرآن ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔

بعض روایات میں قرآن کی مصحف [8] سے تعبیر کی گئی ہے۔ مرحوم ملا فیض کاشانی کافی سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ امام صادق علیہ السلام نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا: بلکہ جب قرآن پڑھو تو مصحف کو دیکھو کیونکہ مصحف کو دیکھنا عبادت ہے۔[9]

حواشی

[1] طبرسی، تفسیر مجمع البیان، فن رابع

[2] معرفت، محمد ہادی، علوم قرآنی، ص۱۰۶

[3] ایضا، ص۱۰۶

[4] اس آیت میں لفظ [ہادی] کا استعمال نہیں ہوا ہے اور یہ لفظ [یہدی] سے ماخوذ ہے جو آیت میں استعمال ہوا ہے۔

[5] اس نام کو آیہ [واعتصموا] سے استفادہ کیا گیا ہے کیونکہ آیت میں لفظ عصمت کا تذکرہ نہیں ہے۔

[6] اس تفسیر کی بنیاد پر کہ سراج منیر سے مراد قرآن مجید ہے۔

[7] اس بنیاد پر کہ [نجوم] نزول تدریجی کے معنی میں ہے۔

[8] اگرچہ قرآن میں آسمانی کتابوں کو صحف کہا گیا ہے لیکن مصحف کا ذکر نہیں ہے۔ دیکھیئے : اعلی ۱۹

[9] تفسیر صافی، ج ۱، ص ۴۴، چاپ اسلامیہ

سورۂ مبارکۂ صافات میں لفظ مخلَصین اسم مفعول کی صورت میں کیوں استعمال ہوا ہے؟ کیا اسم مفعول کو اسم فاعل کے مقابلہ میں برتری حاصل ہے اور اس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند عالم، فقط جن لوگوں نے خود کو خالص بنالیا ہے، انہیں ہلاک نہیں کرے گا؟

مختصر جواب

سورۂ صافات کی مدنظر آیات گذشتہ امتوں کا ماضی بیان کر رہی ہیں کہ خداوند عالم نے شرک کے سبب ان میں سے اکثر کو عذاب میں گرفتار کیا، سوائے چند لوگوں کے جنہوں نے خود کو خالص اور پاک رکھا تھا مخلَصین صرف انبیاء کو ہی شامل نہیں ہے بلکہ غیر انبیاء کو بھی شامل ہے اس لئے کہ اسی سورۂ میں اس کے فوراً بعد حضرت نوح کا قصہ بیان ہوتا ہے کہ واضح طور پر ان کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر نجات پانے والے عام انسان بھی تھے مگر خدا پرست تھے۔

اسی طرح ہمیشہ ایسا نہیں ہے کہ اسم مفعول کو اسم فاعل پر برتری حاصل ہو بلکہ اس

قالب میں استعمال ہونے والے مادہ کے اعتبار سے یہ بات فرق کرتی ہے مثال کے طور پر رازق (اسم فاعل ہے اور خداوند عالم کی صفت) کو مرزوق پر برتری حاصل ہے اس لئے کہ مرزوق مخلوقات کی صفت ہے اور خالق کی صفت کو مخلوق کی صفت پر برتری حاصل ہے اسی طرح خالق و مخلوق وغیرہ ہے، لیکن یہاں پر مخلِص؛ یعنی خالص کرنے والا اور مخلَص؛ یعنی جو شخص مخلِصین کے رنج کو تحمل کرنے کے بعد خداوند عالم کی جانب سے مخلَص اور پاک قرار دیا گیا ہے، اسی لئے مخلَصین کا درجہ مخلِصین کے مقابلہ بلند و برتر ہے۔

تفصیلی جوابات

پیش نظر آیات کا سیاق کفار کی طرف آیات الٰہی کی تکذیب اور شرک اور ان پر نازل ہونے والے عذاب کی طرف اشارہ کر رہا ہے علامہ طباطبائی مرحوم سورۂ صافات آیت 73-74 کے ذیل میں فرماتے ہیں:[1]

یہ وہ کلام ہے جس کا سیاق اس امت میں مشرکوں کو ڈرانے کے لئے ہے جس میں اس امت کے مشرکوں کو گذشتہ امتوں کے مشرکوں سے تشبیہ دیا گیا، اس لئے کہ گذشتہ امتوں کی اکثریت گمراہ ہوئی تھی جس طرح یہ گمراہ ہوئے ہیں اور ان امتوں کی طرف بھی رسولوں کو بھیجا گیا تھا جس طرح اس امت کی طرف رسول بھیجے گئے، ان لوگوں نے رسول کی تکذیب کی سوائے چند گنے چنے بندے ہیں یا بطور اعم مخلَصین اور انبیاء ہیں۔[2]

لہٰذا اس آیت میں مخلَصین سے مراد صرف انبیاء نہیں ہیں، بلکہ اس میں خداوند عالم کے مخلَص بندوں کو بھی شامل کیا گیا ہے اور وہی لوگ ہلاک ہوں گے جو مشرک ہوں گے جس طرح حضرت نوح و ابراہیمؑ کے زمانے والے مشرک جن کی کہانی اسی سورہ میں اس کے بعد ذکر ہوئی ہے کہ سوائے چند افراد کے باقی سب مشرک تھے اور ہلاک ہو گئے۔

مخلِص اور مخلَص کے درمیان فرق کی بازگشت اس (خلص کے مادہ کے معنی میں

فرق کی جانب سے ہے نہ کہ اسم فاعل و اسم مفعول کی طرف ؛ یعنی ایسا نہیں ہے کہ جب کبھی کوئی صفت اسم مفعول کی صورت میں ذکر ہو یا اسم فاعل کی صورت میں ذکر ہو تو اسے ایک دوسرے پر برتری حاصل ہو بلکہ یہ برتری فعل کے مادہ سے وابستہ ہے مثال کے طور پر رازق (اسم فاعل) خداوند عالم کے اوصاف میں سے ہے جو خداوند عالم کے روزی عطا کرنے کو بیان کرتی ہے اور مرزوق (اسم مفعول) خداوند عالم کے مخلوقات کی صفت ہے کہ جنہیں خداوند عالم روزی عطا کرتا ہے، واضح سی بات ہے کہ خداوند عالم کی صفت مخلوق کی صفت پر برتری رکھتی ہے، اسی طرح سے خالق و مخلوق ہے، لیکن مادہ (خلص) میں مخلِص ؛ یعنی خالص کرنے والا جو اکثر و بیشتر انسان کے تزکیہ نفس اور خودسازی کے ابتدائی مراحل کے وقت استعمال ہوتا ہے، لیکن مخلَص تزکیہ نفس کے بعد اعلیٰ مراحل کو بیان کرتا ہے، یعنی وہ مرحلہ جہاں شیطان وسوسہ کرنے سے مایوس ہو جاتا ہے۔[3] اور اس کے معنی خداوند عالم کی جانب سے خالص اور پاک ہونے والا ہے۔

سورۂ حجر میں خداوند عالم شیطان کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے میں پوری نسل انسانی کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلَص بندوں کے [4] یعنی امت کے مخلَصین پر شیطان قابو نہیں پائے گا اور باقی امت اگر چہ اس درجہ پر نہیں ہے لیکن پھر بھی ضروری نہیں ہے کہ مخلَصین کے علاوہ سارے ہلاک ہو جائیں۔ شاید بہت زیادہ مخلِص انسان، تزکیہ نفس اور اپنی کوشش کے ذریعہ خود کو برائیوں سے پاک کر کے اعلیٰ درجوں پر پہنچ جائیں اور ان میں بعض اپنی ظرفیت کے مطابق خداوند عالم کی جانب سے باقی تمام برائیوں سے پاک کر دیئے جائیں اور پاک ہونے والوں کے مرتبہ تک پہنچ جائیں، البتہ اس مرتبہ تک رسائی ان کی بے حساب ان کوششوں کی بدولت ہوگی جو انہوں نے مخلَص بننے کی راہ میں انجام دیں ہوں ؛ دوسری طرف سے خداوند عالم کی حکمت بھی اثر گزار ہے۔

حواشی

[1] فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝

[2] تفسیر المیزان، ج 17، ص 217۔

[3] شرح و تفسیر لغات قرآن کریم، شریعت مداری، ج 1، ص 715۔

[4] سورۂ حجر، آیت 40۔

قیامت میں شفاعت کا کیا مقام ہے؟

مختصر جواب

کمزور کے قوی اور مضبوط کرنے کو شفاعت کہتے ہیں۔ اور شفیع اسے کہا جاتا ہے جو ضرورتمندوں کی مدد کرتا ہے اور اس کو اعتدال اور بے نیازی کی حد تک پہنچا تا ہے۔

قیامت میں شفاعت صرف اللہ سے مخصوص ہے اور کچھ لوگوں کو بھی اجازت دی گئی ہے کہ وہ دوسروں کی شفاعت کریں۔ اس سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت کے دن شفاعت کرنے والے بہت ہیں۔ مثلا انبیاء الہی، علماء، شہدا، ملائکہ، مؤمنین، اعمال صالح اور ائمہ علیہم السلام نیز قرآن مجید۔

شفاعت کا حق صرف اسی کو ہوگا جو اذن الٰہی کے علاوہ اللہ، انبیا، قیامت اور ان سب چیزوں پر مستحکم ایمان رکھتا ہو جو پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں مثلا شفاعت کی حقانیت اور یہ کہ اس ایمان پر آخر زندگی تک ثابت قدم رہے۔

تفصیلی جوابات

جواب کے مکمل طور پر واضح ہونے کے لئے چند چیزوں پر نظر رکھنا ضروری ہے:

۱۔ شفاعت کے معنی: شفاعت کسی کمزور کو مضبوط اور قوی کرنے کے معنی میں اور شفیع اسے کہا جاتا ہے جو کسی ضرورتمند کی مدد کرتا ہو اور اسے اعتدال اور بے نیازی تک پہنچادے۔[1]

۲۔ شفاعت کرنے والے کون ہیں

الف: قرآن کی نظر میں شفاعت کرنے والے

قرآن کریم کی رو سے قیامت کی شفاعت اللہ سے مخصوص ہے۔ [2] اللہ جسے چاہے شفاعت کی اجازت دیتا ہے۔ جیسا کہ علم غیب بھی اللہ سے مخصوص ہے لیکن وہ جسے چاہے دیتا ہے اور اپنے رسول کو دیا ہے۔ [3] شفاعت بھی اللہ سے مخصوص ہے اور اللہ نے اسے اپنے رسول کے علاوہ کچھ دوسرے بندوں کو بھی دیا ہے۔

شفاعت کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ تکوینی

۲۔ تشریعی

شفاعت تکوینی، کائنات کے تمام اسباب و علل سے وقوع پذیر ہوتی ہے اور تمام اسباب اللہ کے نزدیک شفیع ہیں، چونکہ وہ اللہ اور اپنے مسبب کے درمیان رابط ہیں۔

شفاعت تشریع اور قانونی کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ جس کا اثر دنیا میں ہے اور جو الٰہی مغفرت اور قرب الٰہی کا سبب بنتی ہے اور جس میں اللہ اور بندے کے درمیان شفیع ایک واسطہ بن جاتا ہے۔ اس شفاعت میں چند گروہ ہیں: اول؛ گناہوں سے توبہ کرنے والے، [4] دوم؛ رسول اللہ پر ایمان رکھنے والے، [5] سوم؛ انسان کا عمل صالح، [6] چہارم؛ قرآن کریم، [7] پنجم؛ جس چیز کا بھی تعلق کسی نیکی سے ہے جیسے مسجد، مقدس مقامات، ایام اللہ اور انبیاء، [8] ششم؛ ملائکہ، [9] ہفتم؛ وہ مؤمنین جو اپنے لئے اور اپنے دینی بھائیون کے لئے استغفار کرتے ہیں۔ [10]

۲۔ وہ شفاعت کرنے والے جو قیامت میں لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ قرآن سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ قیامت میں شفاعت کرنے والے بھی بہت سے ہیں؛ مثلا انبیاء

الہی، [11] علماء، شہداء، ملائکہ اور مومنین۔ [12]

ب: روایات کی رو سے شفاعت کرنے والے

اس سلسلہ میں شیعہ سنی دونوں کے یہاں روایات وارد ہوئی ہیں جن میں سے کچھ کوک نمونے کے طور پر ہم یہاں پر ذکر کرتے ہیں:

ا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن مومنین حضرت آدم کے پاس جا کر کہیں گے: اے بابا ہمارے لئے جنت کے دروازوں کو کھولئے! حضرت آدم کہیں گے: مجھ میں یہ لیاقت نہیں ہے، وہ لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے وہ بھی کہیں گے کہ میرے اندر اس کی اہلیت نہیں ہے حضرت موسی وعیسیٰ بھی یہی جواب دیں گے اور انہیں میرے پاس بھیج دیں گے۔ میں اٹھوں گا اور اللہ سے اجازت لونگا اور تم مسلمانوں کو بجلی کی رفتار سے پل صراط سے نکال لے جاؤنگا۔ [13]

۲۔ اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں: ہر پیغمبر اللہ سے کچھ درخواست رکھتا ہے لیکن میں نے اپنی درخواست کو قیامت کے لئے روک لیا ہے اور وہ میری امت کی شفاعت ہے۔ [14]

۳۔ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: جو تین چیزوں کا انکار کرے وہ ہمارے شیعوں میں سے نہیں ہے: معراج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قبر کے سوالات اور شفاعت۔ [15]

۴۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی امت کی شفاعت کی اجازت حاصل ہے۔ ہم بھی اپنے شیعوں کی شفاعت کریں گے اور ہمارے شیعہ بھی اپنی اہل کی شفاعت کریں گے۔ [16]

۳۔ شفاعت کے شرائط:

دینی تربیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان اشخاص کو معین نہ کی اجائے جن کی شفاعت ہونا

ہے بلکہ مبہم صورت رکھی جائے۔ [17] جیسا کہ قرآن نے بھی شفاعت کئے جانے والے افراد کو معین نہیں کیا ہے بلکہ ان کے اوصاف وخصوصیات کو بیان کیا ہے اور کہا ہے: ہر انسان اپنے اعمال کا گروی ہے مگر اصحاب یمین جنت میں ہیں اور مجرمین کو ڈھونڈ کر ان سے پوچھیں گے تم کیسے دوزخی ہوگئے؟ وہ کہیں گے: ہم نماز گزاروں میں سے نہیں تھے اور مسکینوں کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور ہمیشہ لوگوں کے بیہودہ کاموں میں شامل ہوجایا کرتے تھے اور قیامت کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ ہم تک یقین آ گیا یہاں پر اب ان کو کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت کام نہ آئے گی۔ [18]

یہ آیت کہتی ہے: کہ اہل دوزخ ان چار صفتوں کے سبب یعنی ترک نماز، ترک انفاق، دنیا کے بیہودہ کاموں میں شمولیت نیز قیامت کو جھٹلانے کی وجہ سے جہنمی ہوئے ہیں۔ یہ چار کام ایسے ہیں جو دین کی بنیادوں کو منہدم کردیتے ہیں۔ اس کے برعکس اقامہ نماز، انفاق، ترک دنیا اور عقیدہ قیامت دین خدا کو قائم رکھتے ہیں چونکہ دینداری کا مطلب یہ ہے کہ معصوم اور پاک رہبروں کی اطاعت کی جائے اور یہ صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب دنیا اور اس کی آرائشوں سے پرہیز کیا جائے اور اللہ کی ملاقات کے لئے تیاری کی جائے اور اگر یہ دو صفتیں عملی ہوجائیں تو بیہودہ لوگوں سے بھی دوری ہوسکتی ہے اور قیامت کی تکذیب سے بھی۔

ان دونوں صفتوں کا لازمہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف پیشرفت ہو اور سماج کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے یا دوسرے لفظوں میں پہلی صفت کو نماز اور دوسری کو انفاق کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا دین کا قیام وقوام ان چار صفتوں پر عمل کرنے سے ہے اور ان چار صفتوں سے دین کے بقیہ ارکان بھی حاصل ہوتے ہیں چونکہ جو توحید پرست نہیں ہے یا نبوت کا منکر ہے وہ ان چار صفتوں کا حامل نہیں ہوسکتا۔ [19]

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہی شفاعت کا حقدار ہے جس میں مندرجہ زیل شرائط پائے جاتے ہوں:

۱۔ اللہ، ابنیاء اور قیامت نیز انبیاء کی لائی ہوئی چیزوں پر سچا ایمان رکھنا چونکہ دوزخ میں جب کافروں سے یہ سوال کیا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں گرفتار ہو گئے تو قرآن کے مطابق ان کا جواب یہ ہوگا کہ [فَمَا لَنَا مِن شَافِعِين] ہمارا کوئی شفیع نہیں ہے۔ لہٰذا کفار کے یہاں شفاعت کی قابلیت نہیں ہے۔ سورہ انبیاء آیہ ۱۸ میں ہے کہ: انبیاء اور ملائکہ شفاعت نہیں کریں گے مگر وہ جنہیں اجازت دی گئی ہو۔ [20] امام رضا علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: دین کے مسئلہ میں پسند مراد ہے۔ لہٰذا شفاعت گنہگاروں کی ہوگی اس شرط کے ساتھ کہ دین اور عقائد میں قابل قبول ہوں اور منکرین، ناصبین اور عداوت رکھنے والے اس سے محروم ہیں۔

۲۔ جو لوگ شفاعت کی حقانیت پر ایمان رکھتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس کی شفاعت قبول نہیں کرے گا جو میری شفاعت پر یقین نہ رکھتا ہو۔ [21]

۳ و ۴۔ جو لوگ نماز اور فقراء پر انفاق کرنے والے ہوں۔

جیسا کہ سورہ مدثر [22] میں ترک نماز، فقراء کی مدد نہ کرنے اور قیامت کو جھٹلانے کو دوزخ جانے کا سبب بیان کیا گیا ہے۔ امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے: وہ شخص ہماری شفاعت تک نہیں پہنچ سکتا جو نماز کو ہلکا سمجھے۔ [23]

بہر حال شفاعت کوئی کھلا اور بے قید و شرط موضوع نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ شرائط ہیں۔ گناہ اور جرم کے بھی کچھ شرائط ہیں، شفاعت کرنے والے کے بھی اور اسی طرح شفاعت کئے جانے والے کے بھی۔ جو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں اور اس موقع سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں انہیں اس کے شرائط پورے کرنا چاہئیں۔ اور ایسے گناہوں سے دوری

اختیار کریں جو شفاعت میں مانع ہیں مثلاً ظلم، شرک وغیرہ۔ یا اپنے کردار کو ایسا بنائے کہ شفاعت کے قابل ہو سکے۔

حواشی

[1] المیزان، ج۱،ص۱۵۷

[2] بقرہ۔۲۵۶؛زمر۔۴۴

[3] جن۔۲۷

[4] زمر۔۵۴

[5] حدید۔۲۸

[6] مائدہ۔۹

[7] مائدہ۔۱۶

[8] نساء۔۶۴

[9] مومن۔۷

[10] بقرہ۔۲۸۶

[11] انبیاء۔۲۸

[12] زخرف۔۸۶

[13] بحار،۸۔

[14] الاختصاص، شیخ مفید، ۳۷ ۳۵

[15] من انکر ثلاثۃ اشیاء فلیس ممن شیعتنا المعراج و المسئلۃ فی القبر و الشفاعۃ بحار،۶۔ ۲۲۳

[16] ایضا۴۸

[17] المیزان۱۔۱۵۹

[18] كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿۳۸﴾ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿۳۹﴾ فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۱﴾ مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿۴۲﴾ قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ

الْمِسْكِينَ ﴿٤٤﴾ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿٤٥﴾ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾ حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ ﴿٤٧﴾ فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾ مدثر ۴۰ تا ۴۸

[19] المیزان، ترجمہ، ۱۔۲۵۹

[20] وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ

[21] من لم یومن بشفاعتی فلا اناله اللہ شفاعتی؛ بحار، ۸۔۳۴

[22] مدثر ۴۰ تا ۴۸

[23] ان شفاعتنا لا تنال مستخفا بالصلوۃ، ۴۔۲۵

بیوی کی اپنے شوہر سے میراث لینے میں ناانصافی کی کیا وجہ ہے؟

مختصر جواب

مرد اور عورت آپس میں متعدد فرق رکھتے ہیں۔ چاہے وہ جسمانی، روحانی یا جذباتی فرق ہو، جس کا لازمہ یہ ہے کہ عالم طبیعت میں ان کا کردار اور عمل ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ ان سب اختلافات اور امتیازات کے باوجود اسلام کا نقطہ نظر ان کے بارے میں عدالت پر مبنی ہے اور مرد اور عورت کے درمیان عدالت برقرار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ ان کے حقوق، فرائض اور ذمہ داریوں میں اعتدال اور توازن برقرار رہے۔

عورت اور مرد کے باہمی حقوق میں ایک حق میراث کا ہے، اور اسلام کے نقطہ نظر سے عورت کی میراث مرد کی آدھی میراث کے برابر ہے، یہ فرق مالی طور پر ان کی ذمہ داریاں مختلف ہونے کی وجہ سے ہے، جن میں نفقہ من جملہ روٹی، کپڑا، اور مکان، عورت کا مہر، دیتِ عاقلہ، جہاد اور اس کے مالی اخراجات وغیرہ شامل ہیں جو صرف اسلام میں مرد کے ذمہ ہیں اور ان کی نسبت عورت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

تفصیلی جوابات

مرد اور عوت کے درمیان جسمانی، روحانی اور جذباتی لحاظ سے متعدد فرق موجود ہیں۔ جو سب کے لئے قابل قبول ہیں۔

پروفیسر ریک جس نے سالوں سال تک مرد اور عورت کے حالات پر تحقیق اور جستجو کی ہے۔ اس نے ان دونوں کے فرق کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں وہ کہتے ہیں مرد اور عورت کے جسم آپس میں مختلف ہیں اور ترکیب کے لحاظ سے فرق رکھتے ہیں ان دونوں کے جذبات کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہوسکتے ہیں وہ ان دو کے علاوہ مرد اور عورت کے درمیان اور بھی فرق کا بھی ذکر کرتا ہے [1]

اسلام کے نقطہ نظر سے مرد اور عورت ایک دوسرے کو مکمل کرنے والے دو انسان ہیں جو ایک دوسرے کے سخت محتاج ہیں اور ان میں ہر ایک دوسرے کے بغیر ناقص ہے۔ پس اس لحاظ سے وہ کبھی بھی ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے مانند نہیں ہوسکتے ہیں، اور ان کا آپس میں جسمانی اور روحانی طور سے ناقابل انکار فرق موجود ہے۔ جو کہ عالم خلقت میں ان کے کردار اور فرائض الگ الگ ہونے کا سبب ہے۔ کیونکہ اگر وہ دونوں لحاظ سے ایک دوسرے کے مساوی ہوتے تو وہ ایک دوسرے کی ضروریات پوری نہیں کرسکتے۔

ان سب اختلافات کے باوجود اسلام کہتا ہے کہ ان کے درمیان عدالت برقرار ہونی چاہئے اور مرد اور عورت کے درمیان عدالت برقرار ہونے کا لازمہ یہ ہے کہ دونوں کے حقوق مختلف اور ان کے فرائض ان کی طاقت کے مطابق ہوں، کیونکہ اگر مرد اور عورت کی طاقت، ذمہ داریاں اور فرائض مختلف ہوں اور ان کے حقوق مساوی ہوں تو یقینی طور پر کسی ایک پر ظلم ہوگا۔

مرد اور عورت کے حقوق میں ایک حق، ایک دوسرے سے میراث لینے کا حق ہے۔ گزشتہ ملتوں کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے نزدیک رہنے والے لوگوں سے

اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ روم، قدیم یونان، ہندوستان مصر اور چین اور عرب کے لوگوں میں عورتوں کو میراث لینے کا کوئی حق نہیں ہوتا تھا۔ [2]

اسلام نے اس ماحول میں غلط سماجی رواج کو توڑ کر عدالت کی بنیاد پر میراث کے قوانین کی بنیاد ڈالی اور میراث کی آیات کو دنیاوی سماج میں نازل کیا۔

اسلام کی نظر میں، بیٹا، بیٹی سے دوگنی، بھائی بھن سے دوگنی اور شوہر بیوی سے دوگنی میراث [3] لیتا ہے، صرف ماں اور باپ کے بارے میں ہے کہ اگر میت صاحب فرزند ہو اور اس کے ماں باپ بھی زندہ ہوں تو ماں اور باپ دونوں میت سے ایک چھٹا حصّہ کو مساوی طور پر میراث لیتے ہیں۔

روایات میں اس تفاوف میراث کے سبب کو فرائض اور مالی اخراجات سے متعلق جانا گیا ہے جو صرف مرد کے شانوں پر رکھا گیا ہے اور عورت کا اس بارے میں کوئی فرض نہیں ہے۔ جیسے مالی اخراجات کرنا:

الف: مہر، اسلامی احکام میں ایک مالی حق جو مرد کو عورت کی جانب ادا کرنا ہے مہر ہے۔ بعض روایات میں [4] عورت کی میراث کم ہونے کی دلیل کو اس کا مہر لینا بیان کیا گیا ہے۔

ب: نفقہ: مالی اخراجات جیسے روٹی، کپڑا اور مکان وغیرہ، یہ مالی خرچ مرد کے مال کے ایک بہت بڑے حصے کو شامل ہوتے ہیں اور اگر پوری زندگی میں مردان اخراجات کو جمع کرے تو شاید یہ اخراجات دسیوں گنا زیادہ ہوں گے۔ جو صرف مرد کے ذمے ہیں اور اگر اس کے ذمہ یہ اخراجات نہ ہوتے یا وہ انہیں ادا نہ کرے، عورت مجبور ہے کہ خود ہی ان اخراجات کو ادا کرے۔ روایات میں عورت کی میراث نصف ہونے کی ایک اور دلیل ان اخراجات کی ادائیگی مانا گیا ہے۔ [5]

ج: خطائی قتل میں دیت کا ادا کرنا: اگر کوئی شخص سہواً قتل کرے تو اس کی دیہ عاقلہ

(رشتہ داروں کے اوپر ہے) اور دیہ عاقلہ صرف مردوں کے اوپر واجب ہے جبکہ عورتوں پر یہ واجب نہیں ہے۔

د: جہاد: ایک اور دلیل جو روایت میں مرد کی میراث زیادہ ہونے کے بارے میں وارد ہوئی ہے مردوں پر جہاد کا واجب ہونا ہے (اسی کے مال سے جہاد کے اخراجات کا ادا کرنا)

یہ چند مواقع سبب بنے ہیں کہ عورت کی میراث مرد سے کم ہو۔

جب یہ سوال حضرت امام صادق علیہ السلام سے ہوا تو حضرت نے اس اختلاف کو میراث میں اس طرح بیان کیا ہے: یہ اس لئے ہے کہ اسلام نے جہاد کو عورتوں کے شانوں سے اٹھایا ہے اور اس کے علاوہ مہر اور نفقہ کو مرد کے اوپر معین کیا ہے اور بعض سہوی قتل میں جو خرچ قاتل کے رشتہ داروں کو ادا کرنا ہے (دیت عاقلہ) عورت کو اس دیت کے ادا کرنے سے معاف کیا گیا ہے اور ان میں سے کوئی بھی خرچ عورت کے اوپر نہیں ہے پس اس کا ارث مرد سے کم ہے۔[6]

حواشی

[1] نظام حقوق زن در اسلام، مرتضی مطہری ص ۱۶۶۔

[2] ترجمہ تفسیر المیزان، ج ۴ ص ۵۷ ۳۵۴۔

[3] سورہ نساء۔ ۱۲۔

[4] علل الشرائع، ج ۲ ص ۲۹۳۔ چاپ اعلمی۔ بیروت۔

[5] کنز العرفان، فاضل مقداد، ص ۶۴۵۔

[6] الکافی، ج ۷ ص ۸۵۔ علی بن محمد ن محمد بن ابی عبد اللہ عن اسحاق بن محمد النخعی، قال سال الفهفكى ابا محمد؏ ما بال المرأة المسكينة الضعيفة، تاخذ سهما و احدا و ياخذ الرجل سهمين فقال ابو محمد؏ ان المرأة ليس عليها جهاد و لا نفقة و لا عليها معقلة انما ذلك على الرجال.

کیا قرآنی آیات اور دعائیں، کامیاب مطالعہ کرنے اور بہتر سیکھنے میں مؤثر ہیں؟

مختصر جواب

مطالعہ، کسی چیز کو غور و تامل سے دیکھنے، سمجھنے اور اس آگاہی پانے کا نام ہے۔ پس جو پڑھنا بھی ان خصوصیات سے خالی ہو اس کو مطالعہ نہیں کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ مطالعہ میں بھی دوسرے کاموں کی طرح خاص شرائط پائے جانے کی ضرورت ہے، تاکہ ان شرائط کے ساتھ ایک مفید اور حسب خواہش مطالعہ کیا جائے۔

کامیاب اور حسب خواہش مطالعہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

۱۔ ہدف، مقصد، اور شوق۔

۲۔ حوصلہ، صبر اور انبساط (خوشی)۔

۳۔ نظم، پروگرام اور مطالعہ کے لئے صحیح اور علمی روش سے آگاہی۔

۴۔ تسلسل، آرام اور تفریح و کسرت۔

۵۔ فہم اور اپنے شعبہ کے مطابق کتابوں کا انتخاب۔

۶ اس جگہ کا انتخاب جہاں شور وغل نہ ہو اور درجہ حرارت اور روشنی کے لحاظ سے بھی

مناسب ہو۔

۷۔ سادہ، مناسب اور معیاری وسائل اور آلات کا استعمال۔ ڈاکٹروں کے مشوروں اور سائنسی نکات کا خیال رکھنا کرنا۔

۸۔خلاصہ اور نوٹ لکھنا۔

۹۔ پڑھے ہوئے مطالب کو حفظ اور ذہن نشین کرنا۔

۱۰۔مناسب غذا کھانا۔

۱۱۔ باطنی طہارت اور معنویت خصوصا ہمیشہ باوضو رہنا۔

۱۲۔بہتر سمجھنے کیلئے دعا کرنا۔

ہمارے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو عالم خلقت کے سب سے زیادہ عالم اور دانا شخص تھے۔اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں رب زدنی علما۔ پروردگار! میرے علم میں اضافہ کر۔

مطالعہ کی دعائیں، ہم آپ کو بتاتے کرتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے: اے میرے پروردگار مجھے اندھیروں سے نکال کرفہم کا نور عطا کر، اے میرے پروردگار، اپنی رحمت کے دروازے میرے اوپر کشادہ کر اور علم کے خزانوں کو میرے لئے کھول دے تجھے اپنی رحمت کا واسطہ اے بہتریں رحم کرنے والے۔

انشاء اللہ اس دعا کو پڑھنے، اور خدا سے بہتر سمجھ اور ادراک طلب کرنے سے (جس دعا کو بھی اور جس زبان میں بھی پڑھیں) مذکورہ شرائط کے ساتھ آپ کے مطالعہ کی کیفیت بہتر اور آپ کا ادراک بڑھ جائے گا۔

تفصیلی جوابات

مطالعہ دقتِ نظر، اور خاص توجہ سے کسی چیز کی جانب دیکھنے کو کہتے ہیں، تاکہ وہ چیز سمجھ میں آجائے اور اُس سے آگاہی حاصل ہو، اس لئے مطالعہ حد درجہ تامل،غور وخوض اور فہم

کے ساتھ ہوتا ہے اور جو بھی پڑھائی ان شرائط اور خصوصیات کے ساتھ نہ ہو اس کو مطالعہ نہیں کہتے [1] بے شک جہل کے اندھیروں سے نکلنے اور علم و آگاہی کی روشنیوں تک پہنچنے کیلئے، بعض شرائط کو فراہم کرنے کی ضرورت ہے وہ شرائط جن کو حاصل کرنے کے بغیر مطلوب اور مفید مطالعہ تک پہنچنا غیر ممکن ہے۔

ہم اس مقالے میں اس مبارک مقصد تک پہنچنے کے لئے ایک کامیاب مطالعہ کے اہم ترین شرائط کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

پہلی شرط: مطالعہ کرنے والے فرد کو بڑے شوق سے مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ ہر کام کا اصلی محرک اس کام کے تیئں شوق اور دلچسپی ہے۔

دوسری شرط: شادابی، انبساط، حوصلہ اور صبر کے ساتھ مطالعہ کرنا۔ کیونکہ کاہلی اور بد مزاجی کے وقت صبر نہیں رہتا اور مطالعہ کرنے کی طاقت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

تیسری شرط: مناسب اور شاداب اوقات میں مطالعہ کرنا جیسے صبح اور سحر کے وقت جب سیکھنے اور یاد رکھنے کے لئے زیادہ قوت ہوتی ہے۔[2]

اگر ہم پیشہ ورانہ طور پر مطالعہ کرتے ہیں تو ہم ہر وقت اور ہر جگہ مطالعہ کر سکتے ہیں مطالعہ کرنے میں زمانہ اور اوقات کی کوئی قید نہیں ہے اور سب اوقات میں ہم لطف اندوز ہو سکتے۔ کیونکہ جو مختلف ٹیسٹ مطالعہ کے اوقات کے مناسب ہونے پر لئے گئے ہیں، اور جن میں مطالعہ کے اثر کو ناپا گیا ہے۔ ان میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ کسی خاص وقت کی باقی اوقات پر کوئی ترجیح نہیں ہے، البتہ یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ رات بھر سونے کے فورا بعد مطالعہ کرنا مطلوبہ اثر نہیں رکھتا اور یہ مطالعہ کامیاب نہیں رہتا ہاں نیند سے اٹھنے کے ۲۰ یا ۳۰ منٹ بعد مطالعہ کرنا ٹھیک ہے اور اس کا اثر حسب دلخواہ رہتا ہے۔

اگر ہم پیشہ ور مطالعہ کرنے والے نہیں جب بھی ہمیں مطالعہ کا شوق ہو مطالعہ کریں

اور جب مطالعہ میں دلچسپی نہ ہو تو ہمیں مطالعہ نہیں کرنا چاہئے۔

چوتھی شرط: مطالعہ با مقصد ہونا چاہئے۔اور کتب اور موضوعات کو مہارت اور فہم کے مطابق منتخب کرنا چاہئے، صحیح اور سائنسی روش کے مطابق مطالعہ کرنا خصوصا تیز پڑھنا نہ کہ کلمہ بہ کلمہ پڑھنا اور کلمات رک رک کر پڑھنے کی روش سائنسی اور علمی لحاظ سے نادرست ہے۔ کیونکہ اس طرح مطالعہ کرنا ذہن کی ظرفیت کو معطل کرکے وقت کے ضایع ہونے کا سبب بنتا ہے۔ اس کے علاوہ مطالعہ کرنے والے کو چوبیس گھنٹے کا نظام الاوقات بنا کر خاص اوقات میں مطالعہ کرنا چاہئے تا کہ یہ پروگرام ہفتوں، مہینوں اور سالوں سال تک چلتا رہے۔ اور ہر طرح کی بے نظمی اور پریشانی دور ہوجائے۔

پانچویں شرط: جو مطالعہ کرتا ہے اسے چاہئے کہ کوشش اور محنت سے اپنے مطالعہ کی عادت پر قائم رہے تا کہ کوئی چیز بھی اسے مطالعہ اور تحقیق کرنے سے روک نہ سکے، اور اپنی محنت اور جد وجھد سے علم کی بلند چوٹیوں کو سر کر سکے۔

چھٹی شرط: محقق اور مطالعہ کرنے والے شخص کو چوبیس گھنٹوں میں بعض ساعات کو آرام اور تفریح کے لئے مخصوص کرنا چاہئے اور ہر تیس یا چالیس منٹوں کے بعد ۵ یا ۱۰ منٹ آرام کرے تا کہ اپنی صحت اور سلامتی کے علاوہ روحانی اور جسمانی طور پر تازہ ہو کر دوبارہ مطالعہ اور تحقیق میں مصروف ہوجائے۔

ساتویں شرط: مطالعہ کرنے کی جگہ، آرام اور ہر طرح کے شور وغل سے دور اور ظاہری سجاوٹ سے خالی ہو اور جو چیز بھی توجہ ہٹانے کا سبب بنے وہ چیز مطالعہ کی جگہ سے ہٹالینی چاہئے اسی طرح مطالعہ کی جگہ پر مناسب روشنی اور درجہ حرارت بھی ہو۔

آٹھویں شرط: مطالعہ کرنے کے وسائل جیسے میز، کرسی سادہ اور معیاری ہونے چاھئیں اور مطالعہ کرنے والے شخص کو بھی ان وسائل کے استعمال کرنے کی آگاہی ہونی

چاہئے تا کہ سائنسی اور طبی نکات کی جانب بھی توجہ کر سکے۔ مثال کے طور پر کرسی پر بیٹھنے اور اٹھنے کا صحیح طریقہ، اور بیٹھنے کے دوران کچھ منٹ چلنا۔ مختصر اور ہلکی کسرت کرنا اور صفحات کی سطح کو آنکھوں سے مناسب فاصلہ پر رکھنا (کم از کم ۳۰ سینٹی میٹر) تا کہ طویل مدتی مطالعہ سے میں بیماری میں مبتلا نہ ہو جائے،

نویں شرط: خلاصہ لکھنا اور کتاب کے اہم اور کلیدی موضوعات اور عناوین کو نوٹ کرنا اور جلی حروف سے مختلف مطالب کی درجہ بندی کر کے ان کے معانی پر زیادہ دھیان دینا تا کہ یہ معانی زیادہ دیر تک ذہن میں رہ سکیں۔

دسویں شرط: خدا پر توکل اور (اہل بیت علیہم السلام) سے توسل اور باطنی طہارت اور معنویت کا زیادہ خیال رکھنا خصوصا ہمیشہ با وضو رہنا، علم حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

گیارھویں شرط: مناسب غذا، اور ذہن کو ضرورت کے مطابق خوراک مہیا کرنا تا کہ اسے سوچنے میں بہتر اعانت ملے۔ خوراک کا پروگرام بھی اسی ترتیب سے ہونا چاہئے تا کہ ذہن کو بہتر کام کرنے کیلئے ضروری مواد فراہم ہو، دودھ سے بنی ہوئی اشیاء، پروٹین، غلات، سبزیاں، خشک اور تر میوے جیسے اخروٹ، بادام، وغیرہ کی سفارش کی جاتی ہے۔[3]

بارھویں شرط: اپنے دل کو خدا کی یاد اور ذکر سے نورانی کرنا اور خدا سے بہتر فہم طلب کرنے کیلئے عربی زبان یا غیر عربی زبان میں دعا کرنا۔

حضرت رسول اکرم جو عالم ہستی میں سب سے زیادہ عالم ہیں خدا سے یہ دعا کرتے ہیں: رب زدنی علما پروردگارا میرے علم کو زیادہ کر۔[4]

مندرجہ ذیل دعا کو پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

اللہم اخرجنی من ظلمات الوہم و اکرمنی بنور الفہم اللہم افتح علینا ابواب رحمتک و انشر

علینا خزائن علومک برحمتک یا ارحم الراحمین۔ خدایا مجھے وہم اور خیال کے اندھیروں سے باہر نکال اور نور کے فہم سے مجھے بزرگی عطا کر۔ پروردگارا اپنی رحمت کے دروازے میرے اوپر کشادہ کردے اور اپنے علم کے خزانوں کو میرے لئے کھول دے، تجھے اپنی رحمت کی قسم اے سب سے مہربان[5]

۲۔ اللھم انی اعوذ بك ان أضل او أضل اوأزل او أزل او أظلم او أظلم او أجهل او يجهل علي اللهم انفعني بما علمتني و علمني ما ينفعني و زدني علما و الحمد لله على كل حال اللهم انی اعوذ بك من علم لا ينفع و من قلب لا يخشع و من نفس لا تشبع و من دعاء لا يسمع۔ [6]

پروردگارا تجھ سے پناہ مانگتا ہوں گمراہ ہونے سے یا گمراہ کرنے سے، غلطی کرنے یا غلطی کرانے سے ظلم کرنے سے یا ظلم کرانے سے نادان بننے سے یا نادان بنانے سے، پروردگارا! میرے علم کو میرے لئے فائدہ مند بنادے اور مجھے وہ چیز سکھا دے جو مجھے فائدہ پہنچائے۔ میرے علم کے درجات کو زیادہ کر، ہر حال میں خدا کا شکر ہے پروردگارا تجھ سے پناہ چاہتا ہوں اس علم سے جو فائدہ مند نہ ہو اس دل سے جس میں خشوع نہ ہو اور اس نفس سے جو کبھی نہیں بھرتا، اس دعا سے جو اجابت تک نہیں پہنچتی۔۔۔۔[7]

ان دعاؤں کو پڑھنے سے اور فہم اور ادراک کو طلب کرنے سے جس دعا کے ذریعے سے بھی ہو اور جس زبان میں بھی ہو، مذکورہ شرائط کے ساتھ، انسان کا ذہن علم حاصل کرنے اور تحقیق کرنے کیلئے زیادہ تیار ہوتا ہے لیکن توجہ رکھنا چاہئے کہ صرف دعا پڑھنے سے لیکن مطالعہ کے شرائط پورے کئے بغیر کبھی بھی با مقصد نتیجہ حاصل نہیں ہوگا۔[8]

حواشی

[1] موگھی، عبدالرحیم، روش مطالعہ اور تلخیص، س ۲۳، پہلی سے چوتھی سطر۔

[2] شجری، ف، یادگیری خلاق، ص ۱۲۵، ۱۵ سطر ۲۵ تک ناشر، انجمن قلم ایران، چھاپ ۱۳۷۷۔

[3] ایضا ص ۱۱۹۔

[4] سورہ ۱۱۴، تفسیر ہدایت، تفسیر، من ہدی القران، ج ۱۴، ص ۳۳۷۔

[5] قمی، شیخ عباس، مفاتیح الجنا، ص ۱۳۰۱، دعای مطالعہ،

[6] شہید ثانی، منیۃ المرید۔ص ۲۱۱۔

[7] منیۃ المرید، ترجمہ، حجتی، سید محمد باقر، آداب تعلیم و تعلم در اسلام ص ۲۶۷۔

[8] مزید آگاہی کیلئے رجوع کریں، ابزار و روش تحقیق، دشتی، محمد، چاپ مہر قم، ۱۳۶۶، روش مطالعہ، ادارہ کل آموزضمن خدمت، چاپ دوم ۱۳۶۰۔شجری، یادگیری، خلاق، ناشر انجمن قلم ایران، چاپ ۱۳۷۷، روش مطالعہ و تلخیص، موگھی عبدالرحیم۔

کیا اسلام کی نظر میں، ایک قاتل اور جارح کافر کے گناہ، اس کے مسلمان ہونے سے معاف ہوتے ہیں؟

مختصر جواب

اسلام میں بعض قوانین ان کافر افراد کے بارے میں موجود ہیں جو مسلمان ہوئے ہیں۔ ان ہی قوانین میں ایک قانون یہ ہے کہ اگر انہوں نے اپنے کفر کی حالت میں خدا کے کسی بھی حق کو ضائع کیا ہے۔ جیسے کوئی عبادت انجام نہیں دی ہے یا کوئی گناہ انجام دیا ہے تو وہ خدا کی طرف سے مورد عفو قرار پاتے ہیں۔

لیکن جو حقوق لوگوں سے متعلق ہیں وہ بخشے نہیں جاتے ہیں بلکہ ان کا ادا کرنا ضروری ہے یا صاحبان حق کی رضا حاصل کرنا ہے۔ پس اگر ایک قاتل یا جارح اپنے کفر کے زمانے میں ان برے اعمال کا مرتکب ہوا ہو اور بعد میں مسلمان ہو جائے تو وہ صرف خدا کے عذاب سے امان میں ہوگا۔ لیکن مالی اور بدنی سزا کو اسی دنیا میں بھگتنا پڑے گی۔ مگر یہ کہ اولیای دم یا باقی شکایت کرنے والے اس کی سزا معاف کریں۔ کیونکہ یہ حقوق اسلام سے متعلق نہیں ہیں کہ مسلمان ہونے سے اسلام انہیں بخش دے، بلکہ یہ حق لوگوں سے متعلق ہیں اور سب ادیان اور عالم کے عاقلوں کے پاس قابل احترام ہیں۔

تفصیلی جوابات

قرآن کریم ایمان لانے سے پہلے کافروں کے برے اعمال کے بارے میں فرماتا ہے پیغمبر آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ یہ لوگ اپنے کفر سے باز آجائیں تاکہ گذشتہ گناہ معاف کردیئے جائیں گے [1] پیغمبر اسلام نے بھی فرمایا ہے: اسلام، ایمان لانے سے پہلے والے برے اعمال کو بخش دیتا ہے بالکل توبہ کرنے کے مانند جو برے اعمال، گناہ اور کفر کو پوشیدہ رکھتا ہے [2] یہ حدیث شریف اسلام میں ایک قانون کی بنیاد بن گئی ہے جس کو قاعدہ جب کہتے ہیں۔

گزشتہ آیات اور حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی مسلمان ہونے کا قصد کرتا ہے اس کو اپنے ماقبل اور برے اعمال سے جو اس نے بجالائے ہیں خوف اور ڈر نہیں ہونا چاہئے کیونکہ خداوند متعال اپنے حقوق (جو کفر کے زمانے میں اس کی گردن پر تھے) کو بخش دیتاھے۔ پس ضروری نہیں ہے کہ جو عبادات اس نے ترک کی ہیں ان کی قضا کرے یا جس مال کی زکات ادانہیں کی ہے اسے ایک ہی مرتبہ ادا کرے کیونکہ خداوند بخشنے والا مہربان ہے اور اپنے حق سے جو بندے کی گردن پر ہے، سے درگزر کرتا ہے [3]

پس جو مسلمان ہوتا ہے اگر اپنے کفر کی حالت میں ایسے اعمال کا مرتکب ہوا ہے جن کے لئے اسلام میں خاص سزا معین ہوئی ہے جیسے شراب پینے کی سزا، مسلمان ہونے کے بعد شرعی حد جو کفر کے زمانے میں اس کے اوپر لاگو تھی، وہ اس کے اوپر جاری نہیں کی جائے گی بلکہ عطوفت اور مہربانی کے ساتھ اس سے سلوک کیا جائے گا اور اسے یہ اطمینان دیا جائے گا کہ گزشتہ اعمال کے بارے میں اسے کسی طرح کا خوف نہیں رکھنا چاہئے، البتہ یہ بخشش صرف اسلامی اور خدا کے حق کے بارے میں ہے لیکن اگر اس کے ذمے لوگوں کا کوئی حق ہو، یا اس نے کسی بندے پر ظلم یا تجاوز کیا ہوتو ان کی ادائیگی کے بارے میں اس کو اقدام کرنا

چاہئے اوران کے حقوق کوادا کردے یا اس کے متعلق سزا بھگت لے، مثال کے طور پر اگر کسی شخص سے قرضہ لیا ہے اور اب اس کا مقروض ہے یا کوئی مال چوری کیا ہے اسے اپنے مالک کو واپس کردے یا ان کی رضا حاصل کرلے اسی طرح اگر اس نے کوئی جرم کیا ہے، کسی کو زخمی کیا ہے یا قتل کا مرتکب ہوا ہے ان اعمال کی نسبت وہ مسئول ہے اور اس سے متعلق سزا کو بھگت لے۔ کیونکہ خداوند اپنے حقوق سے درگزر کرتا ہے نہ کہ دوسروں کے حقوق سے پس لوگوں کے ضائع شدہ حقوق اپنی جگہ محفوظ ہیں اور وہ ان کی تلافی کا اقدام کرے۔

البتہ توجہ کرنی چاہئے کہ صرف احکام اسلامی ہی اس طرح نہیں ہیں بلکہ دنیا کے سبھی دوسرے ادیان اور شرائع اور عقلاء کے درمیان اس طرح کے اعمال کے متعلق قوانین پائے جائے ہیں[4]

بعض علماء نے اس نکتہ کا بھی اضافہ کیا ہے کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہوا اور کسی شخص یا کسی فرد کا حق اس کے ذمے تھا اور یہ نیا مسلمان ان کی ادا پر قادر نہ تھا تو اسلامی حاکم، اپنی صلاح کے مطابق ان حقوق کو بیت المال سے ادا کرسکتا ہے اور اس طرح اس تازہ مسلمان کی مشکل کو حل کرے گا، مثال کے طور پر اگر دیت (خون بہا) اس کے ذمہ ہو اور وہ کفر کی حالت میں قتل میں شریک رہا ہو اور اب مسلمان ہوا ہے تو خون بہا اس کے ذمہ، برقرار ہے اور اسے اس کو ادا کرنا ہے لیکن مسلمان حاکم کو یہ اختیار ہے کہ حکومتی خزانہ سے اس کے قرض کو چکا دے۔[5]

بہرحال یہ فرد ہر حکومت میں (من جملہ اسلامی حکومت کے بھی) سزا کا مستحق ہے اور جو افراد اس کی طرف سے مورد ظلم واقع ہوئے ہیں وہ ایک اسلامی نظام میں، عدالتوں میں جاکر اس سے شکایت کرکے سزا کا تقاضا کرسکتے ہیں۔

حواشی

[1] سورہ انفال۔ ۳۸۔

[2] طریحی، مجمع البحرین، مادہ جب السیر ۃ الحلبیۃ، ج ۳ ص ۱۰۵، یہ حدیث دوسری صورت میں بھی نقل ہوئی ہے جیسے: اسلام اپنے ماقبل کومٹا دیتا ہے، مجلسی، محمد باقر، بحارالانوار ج ۴۰ ۳ ص ۳۳۰۔

[3] رجوع کریں، محقق ہمدانی، مصباح الفقیہ، کتاب الزکاۃ، ص ۱۷، نجفی، محمد حسین جواھر الکلام، ج ۱۷ ص ۱۰۔

[4] مکارم شیرازی، ناصر، القواعد الفقھیہ، ج ۳ ص ۱۶۹،۔۔۔ ۱۸۳ (قاعدہ الجب)

[5] حسینی جرجانی، ابوالفتح، تفسیر شاھی، ج ۳ ص ۹۶